راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا ۱۵واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

فروری 2014

مدیرِ اعلیٰ: عامر بن علی
مدیر: حسن عباسی

اردو نے غیر مرئی طور پر عوام کو آپس میں منسلک کر رکھا ہے ☆ ڈاکٹر علی محمد خاں

اپنے اشعار میر، غالب اور مولا حالی کے مقابلے میں پھُس پھسے لگے تو شعر کہنا چھوڑ دیا

سیاحت کا بہت شوق ہے۔ مشتاق یوسفی اور انتظار حسین بہت پسند ہیں ☆ عامر بن علی کے ساتھ خصوصی گفتگو

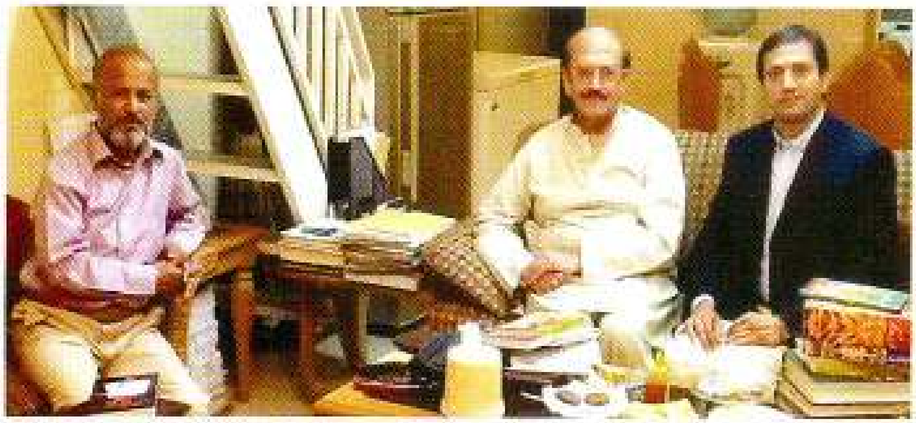

ڈاکٹر علی محمد خاں کے فن اور شخصیت کی کئی جہتیں ہیں۔ ممتاز ماہر تعلیم، معروف مصنف، نامور محقق، انہیں عہد حاضر کا سب سے بڑا خاکہ نگار بھی کہا جاتا ہے۔ تخلیق اور تحقیق کا ایسا خوبصورت امتزاج بہت کم اہل قلم کو نصیب ہوتا ہے۔ جیسا آپ کے ہاں پایا جاتا ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے درس و تدریس سے منسلک ہیں۔ چھتیس (36) کتابوں کے مصنف ہیں۔ میرے لئے یہ اعزاز کی بات ہے کہ میں نے اپنی ایف ایس سی کے دنوں میں ڈاکٹر علی محمد خاں کے ساتھ کالج میگزین "دبستان" کے سب ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ ڈاکٹر صاحب شعبہ اردو کے سربراہ ہونے کے علاوہ کالج میگزین کے چیف ایڈیٹر بھی تھے۔ حرف سے شناسائی میں ڈاکٹر صاحب نے میرے جیسے بہت سے طالب علموں کی رہنمائی کی ہے۔ کئی نسلوں نے آپ سے کسب فیض کیا ہے۔ روایت کے مطابق آپ کے شاگردوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ آج کل بھی ایف سی کالج یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اردو سے بطور پروفیسر منسلک ہیں اور پوری توانائی سے علم کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ شعبہ اردو کے چیئرمین کا عہدہ انہوں نے بوجوہ خود چھوڑ دیا تھا۔

ارژنگ: بات ابتداء سے شروع کرتے ہیں، یہ خیال کب اور کیسے آیا کہ لکھنا چاہیے؟

ڈاکٹر علی محمد خاں: پرانی بات ہے، کیا بتاؤں کہ میں پنڈی بھٹیاں سکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ میں نے 1962 میں بغیر تیاری کے ایم۔اے کا امتحان دے دیا۔ بغیر پڑھے سیکنڈ ڈویژن آ گئی۔ جس سے مجھے غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ میں بڑا لائق فائق ہوں۔ بس وہیں سے لکھنے لکھانے کا سلسلہ چل نکلا۔ پی ایچ ڈی پر مجھے عمر فیضی نے اکسایا اور استاد محترم سجاد باقر رضوی کے اصرار اور شاگردی سے یہ ممکن ہو سکا۔

ارژنگ: آپ کی تربیت میں زیادہ عمل دخل کس کا ہے؟

ڈاکٹر علی محمد خاں: میرے خیال میں بڑے بھائی جمال محمد خان کا میری تعلیم و تربیت میں سب سے زیادہ عمل دخل ہے۔ وہ مجھ سے سولہ سال بڑے ہیں۔ جس سال میں پیدا ہوا، اس سال انہوں نے حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت (ہریانہ) سے انٹرنس کیا تھا۔ بڑے بھائی کے علاوہ عمر فیضی اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کا مجھ پر بڑا اثر رہا۔

ارژنگ: گویا آپ پانی پت (انڈیا) سے ہجرت کر کے پاکستان آئے ہیں؟ اپنے بچپن کے حالات کے بارے میں اختصار سے آگاہ فرمائیے؟

ڈاکٹر علی محمد خاں: میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں میری تاریخ ولادت 7۔ ستمبر 1941 درج ہے۔ چنانچہ قیام پاکستان کے وقت میری عمر چھ سال بنتی ہے۔ مگر ماں جی کہا کرتی تھیں کہ میں 7۔ بھادوں بروز پیر پیدا ہوا تھا اور جب بٹوارا ہوا تو میں چار سال کا تھا۔ اس طرح تقویم کے قاعدے سے میری تاریخ ولادت 22۔ اگست 1943ء بنتی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)۔

(بقیہ صفحہ 24)

MONTHLY ARXANG LAHORE.

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر ۱۶ دسمبر جنوری، فروری ۲۰۱۴ء شمارہ نمبر ۱۲، ۱، ۲

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی مدیر: حسن عباسی

مدیران اعزازی: ڈاکٹر صغرا صدف ، ابرار ندیم ،

نائب مدیر: زبیر بشیر کامران ندیم

مدیر پنجاب رنگ وانچارج شعبہ اشتہارات: نازاو کازوی

پتا برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

0300-4489310

Nastalique786@gmail.com

قیمت فی شمارہ 60 روپے زر سالانہ مع ڈاک خرچ 1000 روپے

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ (پاکستان) 1000 روپے

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ (برائے بیرون ملک پاکستان) 5000 روپے

رابطہ 0331-4489310 0300-4489310

حمد، نعت، سلام: گوہر ملیسانی، سید ریاض حسین زیدی، قیوم طاہر، اسد اعوان غزالی، حکیم سلیم اختر، محمد اقبال پیام، گوشہ: رضا اللہ حیدر ۲ ' ۳

مضامین:

○ علی رضا کی تقتیہ شاعری / آصف شفیع ' ۵

○ آخری آدمی کا تجزیاتی مطالعہ / ثمرا حنیف ' ۸

○ عامر بن علی کا سفرنامہ "آج کا جاپان" / ڈاکٹر کوثر محمود ' ۱۰

○ خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا / غلام محمد آصف ' ۱۱

○ قرآنی خطاطی کے انوکھے ماہر اصغر مغل / املاک جدران ' ۱۴

○ محبت کا وجدان / نصرت زہرا ' ۱۷

○ متفرق شاعری ' ۱۸ تا ۲۰

طنز و مزاح

○ ڈاکٹر اللہ رکھا مرحوم! / عطاء الحق قاسمی ' ۲۱

○ جی الانہ سے حسن عباسی تک / حافظ مظفر محسن ' ۲۲

افسانے

○ محبت کا تاج محل / بی بی حلیمہ بشریٰ ' ۲۶

○ کسک / فرزانہ سلیم ' ۳۰

شعری گوشے: رستم نامی، انجم سلیمی، ڈاکٹر جواز جعفری، ریاض ندیم نیازی ندیم بھابھہ، شہزاد بیگ، اظہر عباس، حرا رانا، نوید انور، ڈاکٹر محمد عثمان، آفتاب خان مبشر بلوچ، بدر سیماب، رانا سردار پرویز، ناز بٹ، رقیہ غزل، روبینہ جلیل

۳۲ تا ۴۸

متفرق نظمیں ' ۴۹ تا ۵۱

اکادمی ادبیات، پاکستان کے کمال فن اور قومی ادبی ایوارڈز / کاظم جعفری ' ۵۲

ادبی خبریں ' ۵۳

تبصرۂ کتب ' ۵۵

نامہ ہائے احباب ' ۵۸

پنجاب رنگ ' ۶۰

ارژنگ دوست بیرون ملک

○ امریکہ، شکیل سروش ○ ابوظہبی، طارق بٹ ○ کینیڈا، شعیب صادق ○ ڈنمارک، صفدر علی آغا

○ بحرین، اقبال طارق ○ کویت، صفدر علی صفدر ○ اسپین، نذیر اے قمر ○ العین، سعید پسروری

○ دوحہ، قیصر مسعود ○ یوکے، سعدیہ سیٹھی ○ فرانس، اسد رضوی

○ سعودی عرب، اسلم گمان ○ ناروے، ارشد شاہین ○ آسٹریلیا، ظفر اسلام

○ دبئی، سلمان جاذب ○ شارجہ، نوید انور ○ سویڈن، عابدہ سیال

Far East Marketing Co.
Samara Mansion 505 Koenji-Minami 1-6-5,
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003, Japan
E-mail-femc1@hotmail.com

حمد

فضائے بحر و بر میں ہر طرف طلعت درخشاں ہے
بہارِ گلشنِ تمہید میں نکہت درخشاں ہے
ترا حسنِ عطا جلوہ نما ہے بزمِ ہستی میں
جہانِ انس و جاں میں بھی تری رحمت درخشاں ہے
جمالِ ابیض و اسود فروزاں ہے پہاڑوں میں
حسیں ذراتِ صحرا میں تری عظمت درخشاں ہے
حرم کا نور دیتا ہے ضیا قلبِ مسلماں کو
وہ مرکز ہے جہاں اسلام کی سطوت درخشاں ہے
ہر اک عہدِ جہاں تیری نوازش سے ہے رخشندہ
رسولِ ہاشمی کی حشر تک بعثت درخشاں ہے
تو ہی معبودِ برحق ہے تو ہی رازق ہے دنیا کا
تری تخلیق کی شام و سحر صنعت درخشاں ہے
ملی ہے شاعرانِ حمد کو افکار کی دولت
خیال و فکر میں گوہر کے بھی حکمت درخشاں ہے

گوہر ملسیانی / خانیوال

حمد

خدا محیط ہے سب پر، بزرگ و برتر ہے
ہر ایک اُس کے مقابل حقیر و احقر ہے
تجل، خفیف ہوا، اُس سے جو بھی دُور ہوا
قریب تر ہے جو اس سے، وہی مؤقر ہے
زباں شناس ہوئے، اُس سے بے نشاں رشتے
رگوں میں تیرتے جذبوں کا وہ نواگر ہے
زمانے بھر کے خداؤں سے بے نیاز ہوا
شہ زمانہ ہے اس در کا جو گداگر ہے
بڑا مزا ہے ملا اُس کو بادشاہی کا
جو اُس کے زیرِ قدم ہے، بڑا قلندر ہے
ریاضؔ اُس کی عنایت ہے سانس کا رشتہ
حیات اُس سے ہے، خالق وہی سراسر ہے

سیّد ریاض حسین زیدی / ساہیوال

نعت رسولِ مقبولؐ

بے اماں راہوں میں اک مشعل جلی ہے آپؐ سے
روشنی ہے، روشنی ہے، روشنی ہے آپؐ سے
ایک رقصِ موت جاری بستیوں میں ہے، مگر
زندگی ہے، زندگی ہے، زندگی ہے آپؐ سے
جلتے سورج کی تپش نے چھین لی ساری نمی
چاندنی ہے، چاندنی ہے، چاندنی ہے آپؐ سے
آپؐ ہی کے فیض سے ادراک سے رشتہ مرا
آگہی ہے، آگہی ہے، آگہی ہے آپؐ سے
کیسے کیسے سر یہاں ہیں اور سودا جہل کا
بندگی ہے، بندگی ہے، بندگی ہے آپؐ سے

قیوم طاہر / راولپنڈی

نعت رسولِ مقبولؐ

نام لیتا ہوں تو جنت کی مہک آتی ہے
سونے جیسی میری مٹی سے کھنک آتی ہے
پاؤں اُٹھتے ہیں مرے جانبِ طیبہ تو، لگے
راستہ میرا سجانے کو دھنک آتی ہے
ذکر کرتے ہوئے جب صلِ علیٰ کہتا ہوں
پھوٹتی صبحوں سی، ہونٹوں پہ شفق آتی ہے
گرد پلکوں پہ سجاتا ہوں رہِ بطحا کی
میری آنکھوں میں ستاروں سی چمک آتی ہے
حوصلہ جنگ میں قیوم کہاں ہارتا ہوں
مجھ تلک بازوئے احمدؐ کی کمک آتی ہے

قیوم طاہر / راولپنڈی

نعت رسولِ مقبولؐ

عقیدتوں کا درخشاں چراغ نعت میں ہے
ہویدا جادۂ حق کا سراغ نعت میں ہے
ہر ایک لفظ معطر ہے بر سرِ محفل
کھلا ہوا جو ارادت کا باغ نعت میں ہے
مجھے زمانے سے کچھ بھی غرض نہیں ہے کوئی
خیال نعت میں میرا دماغ نعت میں ہے
ستارے، چاند، گل و لالہ، کہکشاؤں سمیت
درخت، دشت، جبل، کاہ، راغ نعت میں ہے

سیاہ فردِ عمل ہے مگر یقیں ہے اسدؔ
بروزِ حشر غضب سے فراغ نعت میں ہے

اسد اعوان/ جھنگ

نعت

تاجدارِ انبیاء، خیر البشر، خیر الوریٰ
شاہِ والا، شافعِ محشر، محمدؐ مصطفیٰؐ

خاکِ مکہ پر ہوئی جلوہ نمائی آپؐ کی
یہ جہانِ تیرگی پھر خوب روشن ہو گیا

آپؐ اُمت کے لیے ہیں سائبانِ مغفرت
مضمحل لوگوں کو کیسا مل گیا ہے آسرا

میں نے بچپن میں پڑھا تھا نام پیارا آپ کا
پڑھ رہا ہوں آج تک صلِ علیٰ، صلِ علیٰ

آپؐ کے آنے سے آئیں چار سو شادابیاں
جو گلستانِ جہاں مرجھایا تھا وہ کھِل اُٹھا

کام آئی عاجزی میری بھی آقاؐ کے حضور
نعت کہہ کر اب غزالیؔ سرخرو میں ہو گیا

غزالیؔ/ گوجرہ

نعت

تو سلامت رہے کر دے مرا اک کام ہوا
ان کے دربار میں لے جا مرا پیغام ہوا

اُن کی خوشبو سے مہک اُٹھتا ہے گھر کا آنگن
آ کے اس طرح سجاتی ہے در و بام ہوا

چھو کے آتی ہے جو طیبہ کی حسیں رہ گزر
ہو نہیں سکتی کسی طرح بھی وہ عام ہوا

سبز گنبد کے جھروکوں کو چھوا ہے اس نے
یہ جو اتراتی ہوئی پھرتی ہے گلفام ہوا

ایک بار اُن کی گلی تک تو مجھے پہنچا دے
زندگی اپنی لگا دوں گا ترے نام ہوا

ڈھال کر ذروں میں اخترؔ کو تو لے جا طیبہ
سلسلہ اس کی اُمیدوں کا نہ کر جام ہوا

تو مدینے کی طرف جاتی ہے لوٹ آتی ہے
کتنے خوش بخت ہیں تیرے سحر و شام ہوا

حکیم سلیم اختر ملک/ لاہور

سلام یا حسینؓ

جس کو غمِ حسینؓ سے کچھ واسطہ نہیں
انسان بس وہ نام کا ہے کام کا نہیں

نوعِ بشر نے سارا جہاں چھان مارا ہے
تجھ جیسا کوئی صبر کا پیکر ہوا نہیں

سر کو کٹا کے دینِ نبیؐ کو بچا لیا
باطل کے سامنے وہ ڈٹا ہے جھکا نہیں

قربانیوں کی اک نئی تاریخ کی رقم
تجھ جیسا اس جہاں میں کوئی پارسا نہیں

اس کا پیامِ حق کے لیے اک مثال ہے
اب اس جہاں میں ایسا کوئی آئینہ نہیں

محمد اقبال پیام/ لاہور

مبارک باد

معروف شاعر علی رضا کے اُردو نعتیہ شعری مجموعے ''ثنائے سرورؐ'' کو محکمہ اوقاف و مذہبی امور، حکومت پنجاب کی طرف سے صوبائی سیرت ایوارڈ دیا گیا ہے۔ منصفین کے فیصلے کے مطابق یہ 2013ء کا بہترین نعتیہ مجموعہ ہے اور اس بنا پر اوّل انعام کا حق دار قرار پایا ہے۔ الحمراء ہال لاہور میں 11 ربیع الاوّل کو صوبائی سیرت کانفرنس کے موقع پر یہ ایوارڈ مہمانِ خصوصی میاں حمزہ شہباز شریف نے علی رضا کو پیش کیا۔ یاد رہے کہ ساہیوال سے تعلق رکھنے والے علی رضا پی ٹی وی لاہور میں بطور پروڈیوسر اپنی ذمے داریاں ادا کر رہے ہیں۔ شعر و ادب کے حوالے سے ان کی پانچ کتب اشاعت پذیر ہو چکی ہیں اور وہ شعری حوالے سے بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ''ارژنگ'' کی پوری ٹیم انہیں اس کامیابی پر مبارک باد پیش کرتی ہے اور ان کی مزید ترقی کے لیے دُعا گو ہے۔

رضاء اللہ حیدر / اوکاڑہ

درِ محبوب دو عالم سے رہیں وابستہ — مر کے بھی ہم سے نہ چھوٹے گی گلی طیبہ کی

رضا اللہ حیدر کا تخلیقی وفورِ ادب کی مختلف جہتوں میں صورت گری کرتا نظر آتا ہے۔ شاعری تنقید اور تحقیق آپ کے فنی سفر کے مختلف پڑاؤ ہیں لیکن اظہارِ ذات اور کتھارسس کے لیے شاعری کو ہی اپنی حقیقی جولان گاہ تصور کرتے ہیں۔ شاعری میں جہاں غزل اور نظم ذریعہ اظہارِ ذات ہے وہاں نعت نگاری ان کا تخلیقی اختصاص قرار پاتی ہے۔ مدحتِ رسول اُن کے ہاں تخلیقی سرشاری کی وہ کیفیت پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں تخلیق پانے والی نعت اپنے قاری کو روحانی منطقوں کی سیر کراتی نظر آتی ہے۔ زیرِ مطالعہ نعتیں بھی اسی کیفیت کی مجسم وارداتیں ہیں۔ آپ کا مستقر اوکاڑا ہے اور گورنمنٹ کالج اوکاڑا میں ہی بطور اسسٹنٹ پروفیسر (شعبہ اُردو) اپنے تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ غالب پر اُن کا تحقیقی مقالہ "غالب اور ہم عصر علما" طباعت کے آخری مراحل میں ہے۔ (سخنور نجمی)

یقیناً عشق کا جذبہ ہمارے کام آئے گا
محمدؐ کے غلاموں میں ہمارا نام آئے گا
ارے دُکھ درد کے مارو پڑھو نغمے درودوں کے
بہت تسکین پاؤ گے، بہت آرام آئے گا
کیا پردے میں سورج ہو گئیں بے نوری آنکھیں
فلک سے پھر بھی ایسا نہ کچھ انعام آئے گا
ہوئی خاتونِ جنتؓ کے لیے تاریک سب دُنیا
عمرؓ کے جینے سے آوازۂ کہرام آئے گا
تو پھر تم دیکھنا جاں بھی ہتھیلی پر دھری ہوگی
کسی کے ہاتھ میں جب پرچمِ اسلام آئے گا
حریمِ قدس کو سارے بتوں سے پاک کر ڈالا
نہ اب کعبے میں کوئی پوجنے اصنام آئے گا
حسینؓ و حسنؓ کے ناناؐ شفاعت سے نوازیں گے
کوئی دن ہیں کہ اب وہ لمحۂ انجام آئے گا
مرے اشکوں نے پھر سے حاضری کی التجا کر دی
مدینے سے، رضا تم دیکھنا، پیغام آئے گا

بتا کیا کیا اے میری چشمِ تر دیکھا مدینے میں
بہاریں ہی بہاریں تھیں جدھر دیکھا مدینے میں
سنہری جالیاں، گنبد، فضائیں نور برساتیں
خدا کا لطف تا حدِ نظر دیکھا مدینے میں
پذیرائی بہت دیکھی وہاں درد و محبت کی
فقیرِ بے نوا کو معتبر دیکھا مدینے میں
وہ بابِ مسجدِ نبوی کھڑے ہیں منتظر سارے
ہجومِ عاشقاں وقتِ سحر دیکھا مدینے میں
درِ محبوب کے نظاروں میں گم سارے شیدائی
کسی کو بھی نہیں اپنی خبر دیکھا مدینے میں
تمنا تھی رضا پوری ہوئی اب اور کیا چاہوں
کہ عکسِ جلوۂ خیر البشرؐ دیکھا مدینے میں

دل ہوا جاتا ہے پُرنور گلی طیبہ کی
سوچ میں پھر کوئی چمکی ہے گلی طیبہ کی
پھر تو ہر دل میں کھلے حبِ نبیؐ کے گلشن
بات جب محفلِ یاراں میں چلی طیبہ کی
ہر سعادت درِ محبوبؐ سے ہی ملتی ہے
کیوں گدائی نہ کریں سارے ولی طیبہ کی
ثانی اثنین ابوبکرؓ مکیں اس کے ہوئے
بنے زینت عمرؓ عثمانؓ و علیؓ طیبہ کی
درِ محبوبؐ دو عالم سے رہیں وابستہ
مر کے بھی ہم سے نہ چھوٹے گی گلی طیبہ کی
دوست کرتے ہیں رضا تذکرۂ سرو و سمن
دل کو لگتی ہے مگر بات بھلی طیبہ کی

رحمت کی بارشوں میں شرابور ہو گئے
اُس نورِ اولیں کے ہوئے نور ہو گئے
دامن چھڑا لیا ہے جنھوں نے حضورؐ سے
اللہ کی جناب سے بھی دور ہو گئے
ذرے بھی ماہتاب ہوئے اُنؐ کے فیض سے
بدبخت تھے حسد سے جو بے نور ہو گئے
آئے نبیؐ تو عجز ابوذرؓ فزوں ہوا
بوجہل جیسے اور بھی مغرور ہو گئے
پھرتے تھے غیر خانۂ کعبہ کے آس پاس
اور کعبے والے گھاٹی میں محصور ہو گئے
فرمایا، دست کار ہے اللہ کا حبیب
تب معتبر جہان میں مزدور ہو گئے
اُسوۂ مصطفیٰؐ کا بیاں خوب تر ہوا
قلب و نظر یقین سے معمور ہو گئے
ناموسِ مصطفیٰؐ پہ جو جانیں لٹا گئے
منصور ہو گئے وہی مغفور ہو گئے
خوش بخت ہوں کہ اشک بہاتے ہوئے رضا
اُس بارگاہِ قدس میں منظور ہو گئے

علی رضا کی نعتیہ شاعری

محمد افتخار شفیع / ساہیوال

نعت کا شعر فکر انسانی کی معراج ہے۔ غزل جب باوضو ہو کر در حبیب ﷺ پر حاضر ہوتی ہے تو نعت بن جاتی ہے۔ یہ محبوبۂ دل براں صنف ایسے نادیدہ جزیروں کی دریافت کا عمل ہے جہاں اظہار کی اساس ہی صدق مؤدت ہے۔ اسی صدق رس جذبے کے بطن سے پھوٹنے والی صورت رحمۃ اللعالمین کے حضور گریہ کناں ہوتی ہے۔ اس دشوار گزار مرحلے پر نعت نبی معظم ﷺ کے روحانی اثرات الفاظ وحروف کے ایسے محلات تعمیر کرتے ہیں جہاں تصورات ونظریات کی دیگر سربہ فلک عمارتیں زمیں بوس ہو جاتی ہیں۔ بڑے بڑے عقاید کے اس ہجوم میں ''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے'' کی صورت حال جنم لیتی ہے۔

بنی نوع انسان کے اس نسلی ارتقا میں ''جامعیت کبریٰ'' صرف ایک ہستی کے ہاں ملتی ہے جس کا اسم پرانوار محمد (ﷺ) ہے اور اس کی سرمدی بہاروں کا فیضان حقیقت محمدی ﷺ ہے۔ کون ومکاں کی جلوہ آرائی میں کسی کو بھی درک تام نہیں۔ سرکار ہر دو عالم ﷺ کے ظاہری وباطنی تصرفات کی حدود وقیود کا ادراک ممکن نہیں جو ذات اقدس دائرہ ادراک سے باہر اور خرد ومنطق کی سرحدوں سے ماورا ہو۔ جہاں پیش حضور انور ﷺ عقل انسانی سر جھکائے کھڑی ہو۔ جہاں صورت محمدی ﷺ کا ادراک اور حقیقت محمدی ﷺ کی تفہیم عقول سے برتر ہو۔ اس بارگاہ تک رسائی کا تصور بھی وہاں کیسے ممکن ہے۔ سو شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

''دور تحقیق معنی عظیم گفتہ اند کہ عظیم آنست کہ از حیطہ ادراک بیرون بود اگر محسوس است از حیطہ ادراک بیرون بود، واگر معقول است، ادراک عقل بداں محیط نتواند شد پس چوں وے تعالیٰ، خلق آں حضرت را عظیم وانده و فعلے کہ او ازرہ عظیم گفتہ...... احاطہ عقل از ادراک کنہ آں قاصر باشند''

اگر کوئی ایسی ہستی ہے، جو نبی ذی شان ﷺ کے اصل مقام ومرتبے کا ادعا رکھتی ہے، تو وہ ذات باری تعالیٰ ہے۔ اللہ رب العزت سے بڑھ کر کوئی بھی رسول عربی ﷺ کے مرتبہ ومنصب سے آگاہ نہیں:

آئینہ دار پرتو مہر است ماہتاب
شان حق آشکار، ز شان محمدؐ است
(غالبؔ)

اعجاز از خواص لسان محمدؐ است
عین الحیوۃ گم بہ دہان محمد است
(حالی)

یہ کیفیت بالکل اس طرح ہے، جیسے کوئی آپ، جناب، سرکار ﷺ سے زیادہ کوئی ذی روح خالق ہر دو عالم کے کامل ادراک وعرفان کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس کی ایک مثال سفر معراج ہے۔ یہ سفر انسان کے اس کھوئے ہوئے مقام کی از سر نو سرفرازی کا عمل تھا جو جناب آدم علیہ السلام کے ہبوط اولین سے چھین لیا گیا تھا۔ سید علی ہجویری ''کشف المحجوب'' میں رقم کرتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے دیدار خداوندی کی خواہش کی لیکن اس سے محروم رکھے گئے۔ نبی خدا ﷺ نے عملی طور پر اس خواہش کا اظہار نہیں کیا لیکن دیدار الٰہی سے فیض یاب ہوئے۔ سفر معراج وہ مرحلہ ہے جہاں فیض بندگی اور اوج کبریا کا اتصال ہوتا ہے۔ عقل وخرد کی گتھیاں سلجھتی ہیں اور انسان کو شرف باریابی حاصل ہوتا ہے۔

یہ صورت حال حالات وواقعات کی ایک شبیہ تو سامنے لاتی ہے لیکن اس کے اصل اجزا سے اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی واقف ہیں۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حقیقتوں کی شناسائی آپ کو عطا کی گئی ''ورفعنا لک ذکرک'' کے عشقیہ تناظر میں الفاظ ومعنی کے سارے خراج نامے، عقیدت کے سبھی گل تر اور شعر وسخن کے تمام قرینے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ زمانوں کی دھول اور قرنوں کے سفر نے نہ جانے کتنی شخصیات کے چہروں کے نقوش مدھم کر دیے۔ کتنی عظیم تہذیبیں اُجڑیں تو ان کے خالق اور بانی بھی گم نامی کی نذر ہو گئے۔ قیام ازل سے ایک اسم گرامی ایسا تھا جس کی تعریف وتوصیف کا عمل اور نکھرتا چلا گیا۔ تاریخ نے اس سے بڑا انصاف شاید اس سے قبل کبھی نہیں کیا ہوگا۔ تعریف وتوصیف کا یہی عمل عربی میں ''المدحت النبویہ'' بنا اور فارسی اور اردو میں ''نعت'' کے نام سے معروف ہوا۔ ہر وہ شعر نعت ہے جو مقصد نبوت سے دل بستگی کا سامان پیدا کرے۔ اردو کے لغات میں

نعت کا لفظ مطلق وصف اور مدحِ رسول ﷺ دونوں معانی میں آیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے معانی تو مطلق وصف کے ہیں لیکن اب اس کا استعمال صرف آں حضور ﷺ کی تعریف کے لیے مخصوص ہے۔ حتیٰ کہ جدید لغات میں لغوی معانی غائب ہیں اور اصطلاحی معنی پختہ ہو چکے ہیں۔

اوّلین نعت گو کون ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہی..... جو اوّل و آخر ہے یعنی خدائے یکتا، خدا بزرگ و برتر کی مخلوق میں انسانوں کے حصے میں یہ سعادت بھی آئی ہے کہ وہ مدحت محمد ﷺ سے بارگاہِ ایزدی میں عزت پائیں۔ ایسے مدح سراؤں کی فہرست سازی ناممکن ہے۔ یہ ان گنت سیارگاں کی طرح نور و رنگ کی فراوانی کا عمل ہے جس میں ہر شخص خاص مقام رکھتا ہے۔ شعر و ادب کی دنیا میں علی رضا کا نام نیا نہیں۔ وہ ایک خوبصورت غزل گو اور مرتب و مدون بھی ہیں، ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ کون سا میدان ہے جس میں انہوں نے رنگوں کی گلکاری نہیں کی۔ چوں کہ ان سے قائم شدہ تعلق ربع صدی پر پھیلا ہے اس لیے اس تعلق کی نوعیت بھی عجیب و غریب ہے۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوئی اور طالب و مطلوب کی فکر اگر کسی ایک فریکوینسی پر تھی تو حال پڑ گیا۔ رنگوں کے چھینٹے اُڑے اور ''رشتہ موج است و کنار'' کی صورت حال پیدا ہوئی۔ علی رضا کی ادبی شخصیت کا سب سے غالب پہلو ان کی نعت گوئی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اللہ رب العزت نے انھیں لحن داؤدی کی مثل آواز عطا کی ہے۔ وہ جب نعت پڑھتے ہیں تو محفل میں ان کا بیٹھنا ''اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستہ ای'' کی عملی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے یہ شخص سایۂ اسم محمد ﷺ کی پناہ میں ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی نے علی رضا کی نعت گوئی پر یوں تبصرہ کیا ہے:

''علی رضا کے ہاں اساسِ نعت جذبۂ والہانہ پر استوار ہے۔ وہ ذات کے شعور اور دل کے گداز دونوں کا سرچشمہ اس ذات والا صفات کو تصور کرتا ہے۔ جس کا اسم مطہر ہر قدم پر اس کا رہنما ہے اور جس کے لائے ہوئے دستور سے زمانہ منقلب ہو گیا۔ علی رضا کے نزدیک سوچوں کا باوضو رکھنا آدابِ نعت گوئی میں شامل ہے۔ حضورؐ کی شان رحمۃ اللعالمینی اس کے خیال میں فراخ دلی اور رواداری کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ چناں چہ جس کسی کو حبِ نبیؐ عطا ہو جائے اس کے دل میں بغض اور کینہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ وہ سیرت رسولؐ کے تصور کو قرآن پاک کی تلاوت کے مترادف سمجھتا ہے۔ سبز گنبد اس کے خیالوں میں فانوس کی طرح روشن ہے اور یوں اسے دوری میں بھی حضوری کی نعمت حاصل ہے۔''

علی رضا کی نعتیہ زندگی ایک نعت خواں کی حیثیت سے تو بہت پہلے شروع ہوئی۔ کتابی شکل میں اس کی اوّلین مثال ان نعتیہ انتخاب ''درون اُنؐ پر سلام اُنؐ پر'' کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ اس کے ان کا نعتیہ مجموعہ ''ثنائے سرورؐ'' کے نام سے نستعلیق مطبوعات لاہور سے نہایت طمطراق سے شائع ہوا۔ جس میں ایک حمد اور بہتر نعتیں شامل ہیں۔ علی رضا نے اپنی نعتیہ کتابوں کی صورت میں عقیدتوں اور محبتوں کا خراج نامہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ یہ عزت نہایت قلیل لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ علی رضا کی نعتیہ شاعری مطالعاتی، مشاہداتی، حضوری اور مہجوری کے بھی تناظر کو اس طرح بہم کرتے ہیں کہ حسن تخلیق کو اعتبار حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نایاب دولت بھی ہاتھ آتی ہے۔ یہ دولت توفیقات الٰہیہ کا انعام ہے جو ہر کس و ناکس کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ عقیدت کے چند رنگ دیکھیں:

اسی لیے تو زمانے میں ہے وقار مرا
ثنائے سرورِ کونینؐ ہے شعار مرا

جو اُٹھتے بیٹھتے میرے لبوں پہ رہتا ہے
یہی دُرود ہے پیمانۂ قرار مرا

آپ کا لطف مجھ کو بھی خوب عطا ہوا حضورؐ
آپؐ کے در پہ مل گئی مجھ کو تمام روشنی

بیاں شانِ رسالت کر رہا ہوں
حقیقت میں عبادت کر رہا ہوں

مدح خواں اپنا بنا کر مجھے عزت بخشی
میں زمانے میں تھا ورنہ تہی دامان حضور

بس اسی حسن تکلم ہی کے صدقے
مرے لفظوں کو گویائی ملے گی

علی رضا کی نعتیہ شاعری شستہ اور پاکیزہ ذوقِ سخن کی حامل ہے۔ اس میں داخلی و خارجی کیفیات بھی ملتی ہیں اور معاشرتی، اجتماعی اور کائناتی موضوعات و مسائل کا تذکرہ بھی۔ کیفِ ہجراں اور اشتیاقِ زیارت و دیدار بھی ہے اور حاضری کی سعادت میسر آنے کے بعد کی سرشاری کی کیفیت بھی۔ سب سے بڑھ کر جو چیزیں انھیں ہم عصر نعت کے ممتاز کرتی ہیں وہ سرکارِ مدینہؐ کے اتباع و تقلید کی دعوت۔ بارگاہِ رسالتؐ میں استغاثہ، آشوبِ اُمت کا ذکر اور تاریک رات میں منزل کا چاند طلوع ہونے کی خواہش کا اظہار علی رضا کی نعت کا خصوصی وصف ہے۔ وہ اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا

ہو کر خدائے عزوجل تک رسائی کا پیغام دیتے ہیں۔
ان موضوعات پر ان کا نمونہ کلام دیکھیں:

خیالوں میں ہے روشن سبز گنبد
میں گھر بیٹھے زیارت کر رہا ہوں

......

گو میں نے کیے لاکھ سفر دشت و جبل کے
کیا دیکھا، اگر شہر مدینہ نہیں دیکھا

......

فضائے شہر نبیؐ ہے جہاں میں سب سے جدا
نہ ہو سکوں گا کبھی اس کی میں طلب سے جدا

......

جب ان کے در پہ میں حاضر ہوا تو مجھ پہ کھلا
مری تو سرحد افلاک تک رسائی ہے

......

درِ نبیؐ جو مجھے دور سے دکھائی دیا
پھر اس کے بعد تو کچھ بھی نہیں سجھائی دیا
اذانِ مسجد نبویؐ کا سوز کیا کہیے
یہ سوز مجھ کو بڑی دور تک سنائی دیا
ذرا سی دیر میں جلوہ گہ حضورؐ میں تھا
ذرا سی دیر میں کیا کیا مجھے دکھائی دیا

......

اعزاز نہیں اس سے بڑا کوئی جہاں میں
اس گنبد خضرا کی زیارت کے علاوہ

مدحت سرکار کی بنیاد حب رسولؐ ہے۔ علی رضا کی نعت میں فطری طور پر یہ محبت اور عقیدت عود کر آئی ہے۔ ان کے موجود وارفتگی اور خود سپردگی کے جواہر اس بات کی دلیل ہیں کہ انھوں نے آغاز میں "کن" کا آوازہ سنا اور بحر عشق نبیؐ میں ڈوب گئے۔ یہی وصف ہے جو اسم محمدؐ کے سہارے انھیں زیست کے بے آب و گیاہ صحرا میں مسلسل سفر جاری رکھنے کے لیے تحرک عطا کرتا ہے۔ خالد علیم نے اس سلسلے میں درست کہا ہے کہ

"علی رضا خوش قسمت ہے کہ وہ سوز و الحان کی کیفیتوں اور تخلیق نعت کے منور راستوں سے گزر رہا ہوا اپنے مقصودِ اعلیٰ کے حصول کے لیے رواں دواں ہے اور اس کا تخیل اس قریۂ مستنیر کا راہ داں ہے جو ہر صاحب ایماں کے دل و نظر کا تقاضا ہے۔ وہ اس تقاضے کی پاسداری یوں بھی کرتا ہے کہ اس کے عقیدۂ نعت میں تخلیق نعت کا مقدس فریضہ یہ ہے کہ آپ کا نام اقدس لبوں پر آئے اور سلام و درود کے ساتھ بار بار آئے مگر سوچوں کو باوضو کر کے۔"

ذات محمدؐ کے عشق سے پیدا کردہ "درد و غم" سے یوں سرسری گزرنا غیر مناسب ہے۔ اس کی شدت و حدت علی رضا کی نعتیہ شاعری کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے۔ اس دور حرص و ہوس میں یہ اعزاز کیا کم ہے کہ ہمارے شاعر کا نام بھی اس ہستی کے مدح سراؤں میں شامل ہے جس کے معترفوں میں اولین نام خود خالق اکبر کا ہے۔ علی رضا کا ایک شعر ہے:

تم ہی بتاؤ بجھتے زمانوں کے سلسلو
کس عہد میں حضورؐ کی رحمت نہیں رہی

علی رضا کی نعت اس بات کی گواہ ہے کہ ان کے ہاں موجود تخیل آفرینی اور واضح نصب العین کی یہ دولت انھیں معاصر نعت میں انفرادیت حاصل ہوگی۔ میری دعا ہے کہ خدائے محمدؐ اس بلبل ریاض رسولؐ کے مقدس نعتوں کو بہ حضور سرکار مدینہؐ قبولیت کے لائق بنا دے۔ آمین

ریاض مدحتؐ، جمال سید لولاک اور ذکر
شہ والاؐ جیسے سیرت ایوارڈ یافتہ نعتیہ مجموعوں
کی اشاعت سعادت آثار کے بعد

سیّد ریاض حسین زیدی

کا اوّلین مجموعہ غزل

برگِ گل شاداب ہے

خالد علیم، امین راحت چغتائی، سعود عثمانی،
حسن عباسی، واجد امیر اور افتخار شفیع کی
معتبر آراء سے مزین
شائع ہوگیا ہے

صفحات ۱۷۷...... قیمت تین سو روپیہ
رابطہ: ادب سرائے، ۵۴۷-ایل،
فرید ٹاؤن، ساہیوال

بک ہوم کی نئی کتابیں

افلاک لیے پھرتا ہوں	افضال نوید	500/-
کچھ طائر پنکھ گراتے ہیں	عامر سہیل	400/-
ودھوارگی مانگ	اجمل خیال	240/-
کنی کنی دریا	زاہد مسعود	260/-
فریب آرزو	ناصر الدین احمد	240/-
گمان آگہی	ڈاکٹر افتخار بخاری	260/-

بک ہوم

بک سٹریٹ 46 مزنگ روڈ، لاہور پاکستان
فون: 042-37231518
فیکس: 042-37310854

انتظار حسین کے افسانے ''آخری آدمی'' کا تجزیاتی مطالعہ

نمرہ حنیف

انتظار حسین دانش ور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کو سمجھنے کے لیے خود قاری کا اچھی خاصی دانشورانہ سوچ کا مالک اور قدیم و جدید افسانہ نگاری کے سفر اور اُس کے فنی پہلوؤں سے بخوبی آگاہ ہونا ضروری ہے۔

انتظار حسین کے اس افسانے ''آخری آدمی'' کا مرکزی خیال یہ ہے کہ الیاسف آبادی کا وہ آدمی تھا جو دوسروں کی نسبت سمجھ دار اور عقل مند تھا۔ وہ اپنے گردوپیش کے انسانوں کو شرف انسانیت سے گرتے دیکھ کر عہد کرتا ہے کہ وہ ان کی طرح شرفِ انسانیت سے نہیں گرے گا۔ وہ حتی المقدور کوشش کرتا ہے کہ اُس کی حسیں اور جذبے اُس پر غالب نہ آسکیں اور اشرف المخلوق کے درجے سے نہ گرے۔ بالآخر وہ ناکام رہتا ہے۔ اُس کے ہم قدموں نے احکامِ خداوندی کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی۔ انھیں سبت کے دن شکار سے منع کیا گیا تھا۔ اپنی اس خلاف ورزی پر وہ بلاخوف و خطر اور شرمندہ و نادم بھی نہ تھے۔

الیاسف اُن سب میں زیادہ صاحب دانش و بصیرت تھا۔ وہ صریح خلاف ورزی کی بجائے حیلہ سازی کی راہ اختیار کر لیتا ہے اور ہفتے کے روز مچھلی کے شکار کے لیے گڑھا کھود کر اُسے سمندر سے ملا دیتا ہے۔ الیاسف بھی اُسی حرکت اور جرم کا مرتکب ہوا جس کے مرتکب اُس کے ہم قوم ہو رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے ہم قوموں نے ڈھٹائی سے کوئی پروا کیے بغیر خلاف ورزی کی۔ جبکہ الیاسف نے حیلہ اختیار کیا۔ انجام دونوں کا ایک ہی ہوا۔

الیاسف اپنے تئیں یہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنی قوم کی طرح گمراہ نہیں۔ اُس نے اپنے کھودے ہوئے گڑھے سے اگلے دن مچھلیاں پکڑیں اور بیچ کر زیادہ منافع کمایا۔ وہ اسی طرح ہی کرتا تھا۔ وہ شخص جو الیاسف کی قوم کو سبت کی خلاف ورزی سے روکتا یہ دیکھ کر کہتا کہ ''اللہ زیادہ بڑا قہر کرنے والا ہے'' الیاسف یہ یاد کر کے پچھتا رہا ہے اور اپنے حال پر روتا ہے۔ الیاسف جو اپنی محبوبہ بنت الاخضر کو بہت یاد کیا کرتا ہے اور جس کی خواہش وطلب اُسے بے چین کر دیا کرتی ہے وہ بنت الاخضر جس سے وہ ملنے مکان کے پچھلے دروازے سے جایا کرتا تھا۔ اسے یاد کرتا ہے۔ پھر یہ کہتا ہے' اے الیاسف اُن سے محبت مت کر مبادا تو ان میں سے ہو جائے۔''

الیاسف خون بدل جانے اور اپنی جون بدلے جانے کے احساس سے خوف زدہ ہو کر بے تحاشا بھاگ اُٹھتا ہے۔ تھک ہار کر وہ حقیقت قبول کر لیتا ہے اور چوپائے جانوروں کی طرح بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں طرف پیروں کے بل تیر کی مواقف چلا جاتا ہے۔

قصص القرآن میں بعض قوموں کی گمراہی، نافرمانی اور ناپسندیدہ اعمال کی سزا اور عبرت ناک انجام سے عبرت دلائی گئی ہے۔ قرآن کے انہیں قصص میں ایک یہودی قوم کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ یہ قصہ سورۃ بقرہ کی ۱۶۳، ۱۶۴ اور ۱۶۶ میں بیان کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں احکامِ الٰہی میں سبت یعنی ہفتے کے روز عبادت و آرام کی ہدایت کی تھی۔ لین دین، تجارت اور روزمرہ کے عام کاروبار، شکار، کھانا پکانے اور ملازموں، لونڈیوں، غلاموں سے مشقت لینے کی ممانعت تھی۔ حرمت سبت کی خلاف ورزی کی سزا قتل تھی۔

سورۃ بقرہ کی آیات ۶۴/۶۵ میں کہا گیا ہے۔

ترجمہ: ''پھر تمھیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ تو معلوم ہی ہے جنہوں نے سبت کا قانون توڑا تھا۔ ہم نے انہیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ! اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار پڑے۔''

سورۃ الاعراف آیات ۱۶۳، ۱۶۵ اور ۱۶۶ میں کہا گیا ہے کہ

ترجمہ: ''اور ذرا اُن سے اس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔ انھیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت کے دن احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن سطح پر اُبھر اُبھر کر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ یہ اس لیے ہوا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے .... باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ پھر جب وہ پوری سرکشی کے ساتھ وہی کیے چلے گئے جس سے اُنہیں روکا گیا تھا تو ہم نے کہا کہ ''بندر ہو جاؤ! ذلیل اور خوار!''

مختصراً یہ کہ یہودیوں کے جرائم اور نافرمانیوں و حکم عدولی کی انہیں سزا دی گئی۔ مفسرین بندر بنائے جانے کی کیفیت کی دو تفسیریں کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں بندروں کی سی صفات پیدا ہو گئیں اور حلیہ مسخ ہو گیا۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ انہیں جسمانی طور پر مکمل بندر بنا دیا گیا۔

انتظار حسین نے اپنے اس افسانے آخری آدمی کی بنیاد اسی قرآنی قصے کو بنایا ہے۔ اسی طرح کا ایک اور افسانہ بھی ہے۔ ایک Russian افسانہ نگار نے "Renisore" کے نام پہ یہی افسانہ لکھا جس کا مطلب ہے "گینڈے" اس میں سب انسان گینڈے بن جاتے ہیں۔ جب کہ ایک آخری آدمی جو انسان کی جون میں رہتا ہے وہ خود کو ایک ہوٹل کے کمرے میں بند کر لیتا ہے اور اسی طرح مرتا ہے جبکہ انتظار حسین نے اپنے افسانے میں اس آخری آدمی کو بھی بندر بنا دیا۔ قیاس غالب ہے کہ انتظار حسین نے بھی اُسی منظر میں افسانہ لکھا ہو اور پھر بنیاد قرآنی قصے کو بنایا ہو۔

انتظار حسین نے اس افسانے میں برجستہ اور فصیح و بلیغ زبان استعمال کی ہے۔ کرداروں کے مکالمات، منظر کشی، اسلوب بیان اور علامتیت (علامت نگاری جیسے بندر) سب افسانے کی روانی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس افسانے کے اسلوب پر غور کریں تو اس میں قرآنی اسلوب اور قدیم عرب بلاغت کو اختیار کیا گیا ہے۔ جیسے "اے زبلون کے بیٹے! تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے" اور "تحقیق جس نے اللہ سے مکر کیا اللہ اُسی سے تدبیر کرے گا اور بے شک اللہ زیادہ بڑا تدبیر کرنے والا ہے۔" اس کے علاوہ کرداروں کے نام بھی اسی اسلوب کی عکاسی کرتے ہیں جیسے ابن زبلون، الیاسف، الیعذر، بنت الاخضر وغیرہ

انتظار حسین کے اس افسانے کا بنیادی مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کو انسان اور آدمی کو آدمی ہونا میسر نہیں جیسے غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

آدمی کو انسان بننے میں بہت محنت اور مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ انسان بالآخر گمراہ ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے اندر جتنی مرضی فرشتہ صفت اوصاف پیدا کر لے صراط مستقیم پر چلنا بہت مشکل ہے۔ انسان لالچ، طمع، غرور اور نفسانی خواہشات کا شکار ہو کر احکامِ خداوندی کی صریح اور علی اعلان خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے۔ غصہ، خوف، نفرت، لالچ، شدت صدمہ و گریہ اور نفسانی خواہش انسان کو حیوان بننے اور حیوانی سطح پر لے جانے کی مرتکب ہوتے ہیں۔ مولانا حالی نے کیا خوب کہا ہے کہ:

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

الیاسف نے آخری وقت تک اپنی بشری حسوں، احساسات و خیالات پر قابو پانے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ پھر بھی بندر بن گیا لیکن اگر ہم Russian افسانہ نگار کی طرح خود (کو کمرے میں بند کر لیں، مراد) پر، اپنی نفسانی خواہشات پر، احساسات و خیالات پر قابو پا لیں اور خود کو اسی ایک ذات کے تابع کر لیں جس نے ہمیں پیدا کیا تو ہم بہت سی برائیوں اور اللہ کے عذاب سے بچ سکتے ہیں۔

عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے سفر کی
نہایت دلفریب اور ایمان افروز داستاں پر مشتمل
معروف ناول نگار فوزیہ بھٹی کا ناول

محرم

مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
اُمید ہے یہ ناول اپنے منفرد اسلوب اور دلپذیر
نثر کے باعث قارئین کو بہت پسند آئے گا

دعا پبلی کیشنز
الحمد مارکیٹ، اُردو بازار لاہور
0300-9476417

کراچی میں مقیم معروف ادیبہ
نصرت زہرا کے قلم سے
پروین شاکر کی سوانح حیات، فکر و فن اور
یادوں پر مبنی نہایت ہی دلچسپ اور منفرد کتاب

پارہ پارہ

شائع ہو گئی ہے
اپنے موضوع اور اسلوب کے باعث نہایت
منفرد اور "خوشبو" کی شاعرہ سے محبت کرنے
والوں کے لیے اہم کتاب

ناشر: ایمان زہرا پبلی کیشنز، کراچی
فلیٹ نمبر 1-G/1-B-2 ناظم آباد، کراچی
0322-2668006 پوسٹل کوڈ 74600

آج کا جاپان......اور عامر بن علی

ڈاکٹر کوثر محمود/ راولپنڈی

گو آج انٹرنیٹ اور دیگر ذرائع مواصلات کی ترقی سے کسی ملک یا قوم کے بارے میں کچھ جاننا چنداں مشکل نہیں رہا لیکن اجنبی ملکوں اور لوگوں کے قصے کہانیاں ہمیشہ سے دلچسپی کا موضوع رہے ہیں اور جب راوی بذاتِ خود ایک معتبر ادیب شاعر ہو تو اس میں دلچسپی کا عنصر بدرجہا بڑھ جاتا ہے۔

عامر بن علی...... بالکل جاپانیوں کی طرح ایک معصوم سا چہرہ اور دلآویز تبسم...... لیکن خدا لگتی بات تو یہ ہے کہ جاپان کے متعلق حکیم سعید، ابنِ انشاء اور امجد اسلام جیسے لکھاریوں کی تحریروں کے ذریعے کچھ کچھ شناسائی تو تھی لیکن مذکورہ بالا تمام حضرات کے برعکس عامر بن علی نہ صرف ایک طویل عرصے سے جاپان میں مقیم ہیں بلکہ جاپانی زبان بھی روانی سے لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں۔ عامر بن علی نے جاپان کی ترقی کا نہ صرف مفصل نقشہ کھینچا ہے بلکہ اُن عوامل کی بھی بجا طور پر نشان دہی کی ہے کہ جن پر عمل پیرا ہو کر جاپان موجودہ مقام پر پہنچا ہے جن میں کلیدی کردار تعلیم کو دینا اور اپنی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا، اپنی معاشرت اور تہذیب کو حرزِ جان سمجھنا، دنیا کے مناقشات سے خود کو الگ تھلگ رکھتے ہوئے سائنس اور ٹیکنالوجی میں درجۂ اختصاص حاصل کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

عامر بن علی کی تحریر کی خوبصورتی یہ ہے کہ وہ جاپان کے مختلف سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے بڑی سلیقہ مندی سے قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ایسا ہم کیوں نہیں کر سکتے۔ پیلی ٹوپیاں پہنے ہوئے ایک قطار میں سکولوں کو جاتے ہوئے بچے، بچوں کا صرف نزدیک ترین سکول میں داخلہ، نجی سکولوں کا تقریباً نہ ہونا، یکساں تعلیمی نصاب اور بچوں کو ذاتی گاڑی میں سکول لانے لے جانے پر پابندی...... یہ وہ چھوٹے چھوٹے اقدامات ہیں کہ اگر ہم ان کو اپنے ہاں لاگو کریں اور ان کی قرار واقعی پابندی کریں تو ہماری سماجی زندگی میں کتنا نظم و ضبط آ جائے گا؟

ذرا سوچیے تو! ہمارے بچے اپنے گھروں سے پانی بوتل کیوں لے کر جاتے ہیں؟ کیا ہم اپنے بچوں کو سکول میں صاف ستھرا پانی مہیا نہیں کر سکتے؟ کیا ہم صرف مسجدوں اور امام بارگاہوں میں ہی ٹھنڈے پانی کی سبیلیں لگانے کو جنت میں داخلے کی شرطِ اول قرار دیتے رہیں گے؟

جاپانیوں کی تہذیب اور شائستگی کو عامر بن علی نے سیر حاصل طریقے سے بیان کیا ہے۔ جاپانیوں کا مسکراتے ہوئے اپنوں غیروں کا استقبال کرنا، دوسری جنگِ عظیم میں شکست پر جاپانی شہنشاہ کا خود کو خدا کا اوتار ہونے کے بجائے ایک عام آدمی ہونے پر اصرار کرنا، دنیا کو اسلحہ کے بجائے صنعت و حرفت کے اوزاروں سے فتح کرنے کا اعلان، بے مثل بہادری اور شجاعت سے بھرپور ماضی رکھتے ہوئے شکست کو کھلے دل سے تسلیم کرنا اور کوئی 'یہود و ہنود' کی سازشوں کی طرح کا کوئی عذرِ لنگ نہ تراشنا...... یہ وہ معاشرتی رویے ہیں کہ جن پر عمل پیرا ہو کر جاپانی آج اقوامِ عالم میں سرافرازی کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

کوئی شاعر نثر بھی لکھے تو کیسے ممکن ہے کہ شاعرانہ پیرائے سے گریز کرے؟ عامر بن علی کی نثر متعدد مقامات پر شعریت کا مزہ دیتی ہے...... بچوں کا خزاں رسیدہ پتوں سے آلو اور شکر قندی بھونتا ہو کہ چیری کے سفید اور گلابی پاکیزہ پھولوں کا ذکر ہو یا عمومی صفائی ستھرائی کا بیان ہو تو یوں لگتا ہے کہ عامر بن علی کسی حقیقی انسانی معاشرے کا ذکر نہیں کر رہے بلکہ کسی پریوں کے دیس کی کہانی سنا رہے ہیں اور قاری ان مناظر کو بچشمِ خود دیکھ رہا ہے۔

ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں کا ذکر ہو اور جاپانیوں کے حوصلے اور استقامت کی داد نہ دی جائے! ایسا ممکن نہیں لیکن عامر بن علی نے جوہری توانائی کے عواقب و نتائج اور ممکنہ خطرات کو بڑے سلیقے سے واضح کرتے ہوئے چین، جرمنی اور اسرائیل کی مثال دی ہے کہ مذکورہ ممالک اپنے ملکوں میں تو ایٹمی توانائی کے بڑے منصوبوں کی تنصیب سے گریزاں ہیں لیکن ہم جیسے ترقی پذیر ملک از کار رفتہ ٹیکنالوجی کے پیچھے مرے جاتے ہیں اور ایک ہمسایہ ملک کے زیرِ بار احسان الگ ہوئے جاتے ہیں۔

عامر بن علی کی اس کتاب کو معروف استاد اور نقاد، خواجہ محمد ذکریا نے بجا طور پر پاکستانی قوم کے لیے ایک تحفہ قرار دیا ہے اور خوبصورت شاعر حسن عباسی؛ جو کہ اس کتاب کے ناشر ہیں وہ بھی مبارک باد کے مستحق ہیں...... مبروک عامر!

خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا شاخِ گل کا گل فشاں ہونا

غلام محمد آصف/فیصل آباد

کتاب کے عنوان '' پانی پر بنیاد'' کے مرکزی لفظ ''پانی'' کی معنویت کی غواصی اس حقیقت کی غمازی کررہی ہے کہ پانی کی ماہیت، حیاتِ متنوع کی لحہ بہ لحہ ارتقاء پذیر ارفع واعلیٰ اقدار کے تغیرات کا 'جمال وجلال' سے معمور ایک غیر متبدل پیمانہ ہے۔

دمام دم نقش ہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرارِ زندگی نیست
بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

(حضرت اقبال)

پانی کی کیمیائی ترکیب کی آغوش میں مظاہر فطرت کے دو عظیم مظہر ''موت وحیات''، ''انا خلقنا الموت والحیات لیبلوکم ایکم أحسن عملا'' ادبیات کا بحرِ بے کراں موجزن ہے، جو استمراریت ابدی کی ہر لحہ متغیر ''کل یوم ھو فی الشان'' کی کیف آگیں مے سے معمور ولبریز اور سرمدی تغزل سے آراستہ ہے۔ پانی کے نقاطِ انجماد وتحلیل کے درمیاں طبیعاتی اور ما بعدالطبیعیاتی رُجحانات کا ابتدال، جمال وجلال اور ہجر ووصال کی کیفیات کے مظاہر کو چشمِ حساس نرگس کی مژگانِ لرزاں پر شبنمی موتیوں کی طرح آویزاں کردیتا ہے۔ اِن موتیوں سے نمودار ہونے والی فکری قوس قزاح، تغزل کی رعنائیوں اور رعونتوں کی سیر بین Koleidoscope سے مرقع، مربوط غناسطیت (Gnosticism) کو دعوت دیتی ہے۔ سوائے پانی کے کائنات کی کوئی شے ذاتی نقطہءِ انجماد پر پہنچ کر نچلے استدراجی نظام میں داخل ہونے پر اپنی سابقہ ہیئت کذائی کی طرف راجح نہیں ہوتی۔ اور نقطہءِ انجماد پر پہنچ کر اپنی سابقہ کثافت سے لطافت کی طرف نہیں آتی جب کہ پانی منجمد ہوکر جب برف کی شکل اختیار کرتا ہے تو برف کی کثافت، پانی کی کثافت سے کم ہوجاتی ہے اور سطوحِ ابحار پر ''تجرون'' کے جذبہ سے سرشار برف کی سلیں رقصندہ نظر آتی ہیں۔ انسان کو حیرانی کے تغزلانہ تموجات میں غرق کردیتی ہیں۔ نتیجتاً انسان کی ذہنی کیفیات لا والا کے مجمع البحرین پر اس ردائے لطیف کی متلاشی ہوتی ہیں جو راجع الا ہو، قربتِ حبیب کے اِس لحہء لا لحہ اور مقامِ لا مقام پر انسان پکار اُٹھتا ہے۔

اہل دنیا سے الگ ہیں عاشق
عشق میں ہستی مٹا دیتے ہیں

اس طرح انسان کے قلب متجسس پر '' سَنُعْیرُھُمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ '' آفاقی وانفسی مظاہر فطرت کے اتصال کی جلوہ آرائیاں رونما ہوکر حقیقت الٰہیہ کے عرفان کا باعث بنتی ہیں۔ انسان کی باطنی اضطراری کیفیت کی وفوریت جناب قرۃ العین طاہرہ کے ان اشعار کی استقرائیت کی مرہون ہوتی ہے۔

از پے دیدنِ رُخت ہم چوں صبا فتادہ ام
خانہ بخانہ در بہ در ، کوچہ بہ کوچہ ، کو بہ کو
می رود ز فراقِ تو خونِ دل از دو دیدہ ام
دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

اسی اضطراری کیفیت سے انسان کے رگ وپے میں ایک اندیشہ گردش کرتا ہوا، سطحِ شعور پر ان الفاظ کی صورت رونما ہوتا ہے۔

رب ہے شہہ رگ سے نزدیک
اور وہ......
جاں میں رہتا ہے
رب بھی میرے حال سے واقف
وہ بھی مجھ کو جانتا ہے
رب بھی مجھ کو دکھتا نہیں ہے
وہ بھی مجھ سے
کوسوں دور............
جیسے میرے چہرے پر یہ
میری آنکھیں ہی نہ ہوں

اسی طرح انسان قربت '' نحن اقرب '' کی معروضیت کا دیدار کرنے کے لیے ''قربتِ'' ''او ادنٰی'' تک رسائی حاصل کرنے کے بعد '' ما زاغ البصر '' کی کیفیتِ مستعار سے آراستہ ہو تو اس کے لبوں پہ کلمات پرافشاں ہوجاتے ہیں۔

ہے یہ اعزاز سرکارِ دو عالم کی غلامی کا
سدا جھولی بھری رہتی ہے مولا کی عطاؤں سے

یہاں انسان بود ونابود کی حریصانہ تمنیات سے آراستہ ''لا'' کی فنائیت سے ہم کنار، اک گونہ بے خودی کی آرزو کا خواہاں، تمنائے رفعت سے لبریز پنہائے فطرت میں نہ سمانے والے وجدان سے مزین، گو ہر فرد کی تلاش میں، خود ہی بسمل خود ہی صیاد، '' دام ہر موج میں ہے حلقہءِ صد کام نہنگ '' سے نبرد آزما ہوتے ہوئے، آسودہ وسیارم کی کیف آگیں، ''طہورا'' سے مخمور تمنائے منفرد کا اظہار یوں کرتا ہے:

ٹھہر میں جاؤں کسی محل میں ضیا کی طرح
مگر تمنا مری یوں کسی نہ گھر ٹھہرے

''لا تسبوا الدھر'' زمانے کو برامت کہو، اور ''انا خلقنا کل شیٔ من مآء'' کی سرّ کی معنویت کے مابین دعوتِ فکر ونظر محسوس ہورہی ہے۔ دورِ حاضر کے نظریہءِ اضافیت میں 'وقت' مکاں اور کشش ثقل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وقت اور مکاں کی باہمی امتزاجی سرمدی کیفیت، پانی کی ماہیت بحوالہ کثیف ولطیف، اثر انداز ہوتی ہے۔ وقت کا بھی کثیف ولطیف پن جاری وساری رہتا ہے۔ کثافت کی صورت میں مکان اور لطافت کی صورت میں علم الکتاب کی حیثیت سے اپنا اظہار کرتا ہے۔ مکان کی صورت میں علم طبیعیات اور علم الکتاب کی صورت میں

تختِ بلقیس کو کلمح البصر کے دورانیہ میں حاضر کردیتا ہے۔ پانی اور وقت کی یہی کیفیات معجزانہ شاعری کو جنم دیتی ہیں اور یہی ضیائے شعریت کسی محل کی تزئین کا باعث بننے کی خواہش کرتی ہے۔ لیکن گریزپا تمنائے ارتقا مکاں میں مقیم ہونا نہیں چاہتی اور ارتفاع لامحدود کی آرزو سے عقل و وجدان کو سیراب کرتے ہوئے الا کی جانب "اللہ جمیل ویحب الجمال" کے عرفان کاملہ کے حصول کے لیے وجدان وادراک کے بازوؤں کی وساطت سے "شب جائے کہ من بودم" کی نزاکتوں کو ذات میں جذب کرنے کی غرض سے ذاتی تمنائے اسراء کے دوش پر سوار سیر افلاک کرتا ہوا انسان خالق کائنات کے حضور ذات کی تکمیل کی استدعا کرتا ہے اور قبولیت دعا کے فوری بعد اس مقام تک رسائی حاصل کرنے پر اُس "واتخذوا سبیلا من اناب الیّ" کا مقدس ذکر کرتا ہے جس کے متعلق حضرت عزت بخاری نے فرمایا:

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

ان تاثرات انہیں کا اظہار یوں کرتا ہے۔

رہائی مل گئی رنج والم سے ابتلاؤں سے
سجا رکھا ہے دل درودوں سے ثناؤں سے
تصور میں سجا رہتا ہے، عکس گنبد خضراء
مہکتے ہیں مرے دن رات، طیبہ کی ہواؤں سے
ہے یہ اعزاز سرکار دو عالم کی غلامی کا
سدا جھولی بھری رہتی ہے، مولا کی عطاؤں سے
عرب کی خاک کے ذرے ستاروں سے بھی پیارے ہیں
ہیں کم تر تاجور بھی میرے آقا کے گداؤں سے
محبت آپ کی، سوچوں کو پر انوار کرتی ہے
زمین دل رہے شاداب رحمت کی گھٹاؤں سے
وسیلہ آپ رحمت کا سر پر ہاتھ رکھتا ہے
کبھی جو خوف آتا ہے ہمیں اپنی خطاؤں سے
خوشا بخت رسا گل، ان کی چاہت سے گل تر ہیں
نگاہ شوق روشن ہے مودت کی فضاؤں سے

"الست بربکم" کی تنویرات کو جب علم الاسماء میں سموکر، اعتراض ملائکہ کو رفع کرنے کے بعد مسجود ملائک بنا کر، فردوس بریں میں رہنے کا حکم دیا گیا تو فردوس کی فضاؤں میں یزداں کی اس تخلیق بصورت تزویج جمیل، آدم و حوا کی آرزوؤں کی تحصیل، بغیر کسی کوشش کے محض بشائیت قلب وتخیل کے تحت، اثمار جانفزا کی شکل میں ان کی آغوش میں گر جاتی تھی۔ قربت شجر ممنوعہ جو وجہِ تخلیق کائنات ہوئی کی بنا پر اس تزویج جمال کو "اھبطوا" کے حکم سے رقاصہ خلاء، زمین پر اُتار دیا گیا تا کہ نقش ناز بت طناز، کے پائے طاؤس کی تزئین کے لیے 'نون والقلم' کو ذریعہ بنائے۔ زمین پر اُترنے کے بعد ان کے قدم وصل کی آغوش سے محروم ہو گئے اور ہجر کی تمازتوں نے انہیں خلائے بسیط میں لپیٹ لیا۔ ہجر کی حرارت نے جب ان کے قلوب کو دوبارہ وصل کی آرزو نے شعلہ فشاں کردیا تو ان کی زبان مبارک پر تسبیح جانفزا جاری ہو گئی:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا ....

اس ادائے دل فریب کے الفاظ کی تغزلانہ ادائیگی نے عرش معلیٰ کو جا بوسہ دیا۔ اسی لمحہ لالمحہ پر جب ہر بن مو چشم دل بینا کے کام کرنے کے باوجود تحری حسن کو ترستے ہوئے انسان کی حالت زار کچھ یوں ہوتی ہے:

تو سامنے ہو میرے اور وقت تھم جائے
خموش لب ہوں کرے آنکھ گفتگو تیری!

جب انتظار کی ساعتیں طویل سے طویل ہو جائیں تو اس وقت یک لخت تبدیلی آتی ہے، وقت کثیف سے کثیف تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا استعارہ الفاظ میں ظاہر ہوتا ہے:

وقت لگتا ہے ٹھہرا ٹھہرا ہوا
ایک پل سال میں گزرتا ہے

لیکن زمان ومکان کی سرمدیت کا یہ معجزاہ مرحلہ بوسیدہ مقرونیت (Concrecteness) کو یکسر مختلف غیر محسوس اور غیر مرئی انداز میں خواب گاہ مقرونیت میں پنہاں ہو کر، ایک حریرے کی مانند (کیڑے) کی مانند تغزلانہ ریشوں کی تخلیق و پرورش کرتا ہے۔ احساسات کے انہی ریشوں کو خامہ گلفام تغزل کے پیرہن میں سجا کر اپنی روح کی موسیقی سے جذبہ "حبر الخط والشعرا" سے سرشار قرطاس پر منتقل کردیتا ہے۔ یہ مرحلہ اُسی لمحے طے ہوتا ہے جب صریر خامہ میں موجود نوائے سروش کی تمازت سے قلم اور قرطاس کے درمیان واقع منافقت کا وجود مفقود ہو جائے۔ تزویج جمال وجلال کے اس لمحہ، غیر مترقبہ کے دوران میں زخم شعروں میں بدل جاتے ہیں۔

زخم کوئی جو گل کو لگتا ہے
شعر بھی بے حساب ہوتے ہیں

جو حظوظ روحانی اُسی وقت ارزانی ہوتے ہیں جب ظاہری آنکھ کی بصیرت چشم باطن بن جاتی ہے اور غیب کے حریری پردوں کے جھرنوں کی استغراقی کیفیت بے پناہ انسان کو مسحور کر لیتی ہے۔ چشم محبوب میں ممتاز حیثیت حاصل کرنے کی غرض سے ہمہ وقت آرائش جمال میں مصروف، نقاب ہی کو آئینہ بنا کر، عشق بلاخیز، فرد کو تزئین ذات کی خاطر، استغراق ذات کی رعنائیوں سے مالا مال کردیتا ہے اور انسان کیف نرگسیت سے سرشاریوں خود کلام کرتا ہے:

جب دیکھتی آنکھیں بجھ بھی گئیں
ہم کس کے لیے سنورتے ہیں

اور تزئین ذات کے غیر مختتم تواتر کے دوران میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب انسان اُس نامعلوم محبوب کے حلقہء انوار (Nous) میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کے زمزمہ، تحریرے سے مترشح ہونے والے احساسات ان الفاظ میں ڈھل جاتے ہیں:

ہو تیرا قرب ہی جینے کا آسرا مجھ کو
میں تجھ سے دور نہ جاؤں تو تیرے پاس آؤں

اس حلقہء انوار (Nous) کی ضیاؤں اور خوشبوؤں سے اپنے دامن کو سجا کر ان محسنات شعری سے جہان کاف ونوں کے چمنستانوں کو مستفید کرنے کے لیے وجود گل اپنے اشکوں سے برگ ہائے یاسمن کو موتیوں کی طرح مرصع کردیتا ہے:

وجود گل کی وہ خوشبو چمن چمن پہنچی
وہ اپنے اشک چنبیلی پہ رکھ کے آئی تھی

یہ خوشبو اُس وقت ہی نفوذ پذیر ہوتی ہے جب غزالانِ صحرا، ہجر کی تمازت دل میں بسائے، جنوں جولانیاں کرتے ہوئے، اپنے محبوب کی تلاش میں صحرا نوردی کرتے ہیں اور محبوب سے وصل کی آرزو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتی تو وہی آرزو، روح وجسم کے حسین امتزاج میں کسی حظیرۂ قدس میں پناہ لے کر ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی تخلیق احسن میں رونما ہو کر کستوری میں متشکل ہو جاتی ہے اور جب انسان انہی مرحلہ ہائے شوق کو طے کرتا ہے تو اس کے احساسات کے ریشے، زلف حورعین کی شکل اختیار کرتے ہیں تو کستوریٔ روحِ خاتونِ ادب، یعنی غزل کے روپ میں ڈھل جاتا ہے:

اگرچہ گردِ صبح و شام ہیں ہم
محبت میں کہاں ناکام ہیں ہم
ہماری داستانیں جا بجا ہیں
کہیں عرفان، کہیں گلفام ہیں ہم

اور جب محبت کی کستوری نافۂ قلب میں موجزن ہو تو نہاں خانۂ دل سے موجِ بے قرار کی مانند، ان اشعار کی صورت 'قلم کی نوک پر رقصاں ہوتے ہوئے' قرطاس پر رونما ہو جاتی ہے۔

پنہاں ہے دل میں جو خوشبو ترے سوا تو نہیں
کوئی سفر میں یہ ہرسول تیرے سوا تو نہیں
مری حیات کا بس تو ہی مرکز و محور
مرا وظیفہ ہے بس تو تیرے سوا تو نہیں

غزل بتند فراوانِ وصل سے بھی معمور ہوتی ہے اور ہجر کے "ملحِ اُجاج" سے بھی، ملحِ اُجاجِ ہجر کی طاغوتی لہروں کا ہیجان ان اشعار کے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔

وہ مرا ہے یا نہیں کھل کے یہ کہتا بھی نہیں
مجھ میں رہتا ہے مگر پاس تو رہتا بھی نہیں
اپنے سب رنج والم سونپ چکا مجھ کو
کتنا ظالم ہے مرے درد کو سہتا بھی نہیں
سوکھے پتھر کی طرح رہ میں پڑی ہوں کب سے
کیسا جھرنا ہے جو مری سمت بہتا بھی نہیں

احساس کے انہی شذرات کی شعلہ فشانی ملاحظہ ہو:

دیارِ جاں میں کبھی آ اُتار کر آنکھیں
اِدھر بھی دیکھ ذرا مجھ سے چار کر آنکھیں
کہاں کہاں ہے تو "اے محوِ آئینہ داری"
جو تیری سمت تکیں ہیں، شمار کر آنکھیں
تیری تلاش کا یہ سفر ادھورا رہا
افق کے پار سے لوٹی ہوں اتار کر آنکھیں
ترے جمال کی حدت عجیب حدت تھی
میں جیسے آگ سے لائی اُتار کر آنکھیں
خیالِ یار کبھی دل کی رہ گزر سے گزر
وصالِ یار کبھی گل بہار کر آنکھیں

حیات وموت اور ہجر ووصال کی موجوں کے ادغام ووصال کے اس اجتماع کا مرکز جب قلب انسان کو اپنی آغوش میں لے لے تو اس کی حرارت سے غزالِ صحرائے دل، نیش آمادہ تراز خونِ زلیخا ہو کر یوسف صریرِ خامہ گلفام کے حضور یوں حاضر ہوتا ہے:

رقص کرتے ہیں عجب سائے رات ہوتے ہی
کیسی وحشت سی اُتر آئے رات ہوتے ہی
آسمانوں کا وہ کرتی ہے سفر لمحوں میں
دل سے اُٹھتی ہے جو اک ہائے رات ہوتے ہی

اور جب یہ آہ وجہاں سوز، زود پرواز، جس کی رفتار، شعور کے حوصلہ گرفت سے باہر ہے، ارتعاج سماوی اور تنزیل بسوئے ارض کے اسفار روحانی طے کرنے کے بعد، یقین کامل سے آراستہ، عزم لم یزل کے زور پر، وصالِ یار کی حسین، پرکیف آبشار کی شناوری کرتے ہوئے، مناقشات سابقہ کو ختم کرنے کے بعد رومانی انداز سے یوں پرافشاں ہوتی ہے:

تمہیں ہم سے جو اُلفت ہے یہ الفت ہو گئی کب سے
تمہارے دل میں چاہت ہے، یہ چاہت ہو گئی کب سے
تمہیں تو پیار کی باتوں سے سخت نفرت تھی
اب ان باتوں سے راحت ہے یہ راحت ہو گئی کب سے

ہجر ووصال اور جمال وجلال کی آمیزشوں اور آویزشوں سے بہنے والے سرچشموں کا ترنم جانفزاء وجاں سوز، ہر شے کی تحسین (Apprcclation) کے جذبہ کو اُبھارتا ہے اور اس لطف اندوز ہونے کی تاکید کرتا ہے۔ انہی تموجات کے غلغلہ کا مصدر جب قلب انسان ہو تو "پانی پر بنیاد" جیسی تخلیق مرہونِ صریرِ خامہ گلفام ہوتی ہے جو تلخ وشیریں کا دل فریب اور حسین امتزاج ہے۔ احساسات کا یہ منفرد مرقع ان اشعار کے الفاظ کا پیرہن زیب تن کرتا ہے۔

ہزار ہم پہ کرو تم ستم ہم تمہارے ہیں
تمہارے ہو جو گئے ہم تمہارے ہیں
سیاہ رات کے آنچل کو اوڑھ رکھوں گی
سیاہ شب نے جو بخشے ہیں غم تمہارے ہیں
اس ایک در کی طرف دیکھتی رہو گلفام
سب اہل دہر، سب اہل حرم تمہارے ہیں

جب خدا اور محبوب کے امتیازیات محو ہو جائیں تو دبستانِ ادب کی روح غزل تخلیق ہوتی ہے۔ روح یک بار ہی نہیں پھونکی گئی، یہ عمل انسان کو بذاتِ خود بھی جاری رکھنا پڑتا ہے اور جمالیاتی پیرہن سے آراستہ جذبات کی ترجمانی کے لیے سلطنتِ تغزل پر موسیقار کی مانند، جب وہ اپنے ساز میں اپنے حلقوم سے روح پھونکتا ہے، سریر آراء ہونا پڑتا ہے۔ زندگی کے ہر سانس کے ساتھ پیغامِ دوست کے حصول کے لیے "الست بربکم" کے جواب میں "قالوا بلیٰ" کی غنائیت سے شاعری کا سہارا لینا پڑتا ہے اور خود مرقع جمالِ دوست بن کر جمالِ یار کا دیدار کرنے کے لیے رگ ہائے جاں کو ستار کی تاروں کی مانند نغمہ سرا ہونے کے قابل بنانا پڑتا ہے تاکہ دیدارِ یار میں پوشیدہ اسرار ورموز کو منکشف کیا جا سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب "ما ینطق عن الھوی" سے لیس ہو کر اپنی ہر خواہش کے لہو سے دار کو رنگین کیا جائے تو کہیں جا کر وحی روح جس کا نام شاعری ہے کا نزول قلب انسان پر ہوتا ہے۔ یہی وحی روح گلفام "پانی پر بنیاد" کی شکل میں "قلب گلفام سے خامہ گلفام کے ذریعے منظر عام پر آتی ہے۔

بین الاقوامی شہرت یافتہ قرآنی خطاطی کے انوکھے ماہر اصغر مغل آرٹسٹ پس منظر، حالات زندگی اور فن

املاک احمد جدران/اوکاڑہ

اصغر مغل کے آباؤ اجداد کا تعلق بھارتی صوبہ پنجاب کے شہر جالندھر کی ایک بستی باوا خیلاں سے ہے۔ تقسیم ہند کے وقت مسلمانوں کے خون سے کھیلے جانے والی ہولی کا سلسلہ اسی بھارتی صوبہ پنجاب سے شروع ہوا تھا۔ پاکستان جس کی بنیادیں ایک محتاط اندازے کے مطابق تیس لاکھ سے بھی زائد بے گناہ مسلمانوں کے خون سے گوندھی گئی مٹی سے استوار کی گئی ہیں اس کا بن جانا ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔ تلواروں، کرپانوں اور نیزوں کی انیوں پر بلند ہونے والی دلدوز چیخوں کو آج بھی ایک ادراکی عمل کے ذریعے سے سنا جا سکتا ہے۔ ان گنت انسانی لاشوں کے تعفن سے ہیضے کی وبا کا پھوٹ پڑنا جس کے نتیجے میں انسانی جنازوں کی قطاروں کا لگ جانا ایک الگ المیہ ہے۔ کئی روز تک مسلسل بارش کا برسنا اور پھر نشیبی علاقوں کی جانب انسانی لاشوں سے لدے ہوئے دریا کا کسی انجانی منزل کی طرف بڑھنا ایک ایسا دل ہلا دینے والا منظر ہے جسے انسانی آنکھ نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ بروز جمعۃ المبارک کی ستائیسویں شب کو معرض وجود میں آنے والے پاکستان میں یقیناً خدا کی مرضی شامل ہے۔ دیکھنے والی آنکھوں کو آزاد پاکستان کی طرف بڑھنے والے قافلوں کی بے آبروئی کے مناظر آج تک نہیں بھولے ہیں۔ زندہ بچ جانے والے قافلے کا ایک کردار اللہ دتہ مغل ہے جو اصغر مغل کے والد محترم ہیں۔ اللہ دتہ مغل کو پاکستان میں آ کر جہاں شکرانے کا سجدہ ادا کرنے کا موقعہ ملا وہ گوجرانوالہ کا خوبصورت شہر ہے لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر ان کے والد محترم اپنے قبیلے کے ہمراہ اوکاڑہ شہر کی ٹھنڈی سڑک بالمقابل ٹیکنی باغ کے ایک مکان میں رہائش پذیر ہو گئے۔ اصغر مغل اسی مکان میں 1953ء میں پیدا ہوئے۔ زندگی خوف اور ڈر کے حصار سے باہر نکلتی ہے تو رزق کی تلاش شروع کر دی گئی۔ ان کے والد محترم ایک روپیہ پچیس پیسے کی مزدوری پر کارپینٹری کے کام میں مصروف ہو گئے۔ جبکہ ان کے دوسرے بھائی مختلف ہنر سیکھنے لگے۔ انہی دنوں ان کی والدہ محترمہ اپنے والدین سے ملنے کے لیے عارف والا شہر میں چلی جاتی ہیں اور عارف والا میں موجود ایک فتنہ نامی ڈیری فارم میں آگ جلانے والی لکڑیاں اکٹھی کرتے وقت ان کی والدہ محترمہ کے پاؤں میں چبھ جانے والے کانٹے نے ایک نئی مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ کانٹے کا زخم ایک ناسور کی شکل اختیار کر گیا۔ معاملہ عطائی ڈاکٹروں کے ہاتھوں سے نکل کر آپریشن تک جا پہنچا۔ جس کے نتیجے میں ان کی والدہ محترمہ کا ایک پاؤں کاٹ دیا گیا لیکن زخم اپنی مدھم رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور پھر اوکاڑہ کے مشہور ڈاکٹر حسن محمد نے ان کا دوبارہ آپریشن کیا۔ ان کی والدہ محترمہ کے حصے میں ایک ٹانگ کی محرومی آئی۔ گھر کی تمام پونجی ان کی والدہ محترمہ کی بیماری پر خرچ ہو گئی۔ گھر کے برتن تک بکنا شروع ہو گئے۔ قریبی رشتہ داری بھی بے سہارا ثابت ہوئی۔ غریبی سر چڑھ کر بولنے لگی رشتہ داری کے آپسی تنازعات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس گھر کو چھوڑ دینے میں ہی عافیت سمجھی گئی۔ ایک دفعہ پھر اپنے ہی شہر میں مکانات بدلنے کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مہنگے کرایوں والے مکانات میں رہنا ایک خواب بنتا گیا۔ بالآخر اوکاڑہ شہر کی ایک ویران بستی عیدگاہ میں دو چھوٹے کمروں کے ایک کچے مکان میں رہائش رکھنا ان کے والدین کی مجبوری بن گئی۔ اصغر مغل کے والد محترم مزدوری کر کے گھر واپس آتے تو پسینے سے شرابور جسم کو پنکھے کی ہوا کی ضرورت محسوس ہوتی۔ ایک شام گھر لوٹتے ہوئے ان کے والد محترم اقساط کی صورت میں خریدا ہوا پنکھا لے آئے لیکن کاتب تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نجانے موت کس گھڑی پنکھے میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ سانسوں کو روک دینے والا لمحہ پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے کھڑا تھا۔ ہونی اپنا وار کر گئی کرنٹ زدہ پنکھا ان کے والد محترم کے جسم کا پورا لہو نچوڑ کر لے گیا۔ ایک مزدور پسینہ خشک کر دینے والی اپنی کمزور خواہش کو لے کر منوں مٹی کے نیچے دفن ہو گیا۔ گھر کی مکمل کفالت کا بوجھ ان کی والدہ محترمہ کے ذمہ تھا۔ بیساکھیوں کے سہارے چلنے والی معذور ماں کی خواہش ایک ایک وقت کے کھانے کے لیے ترستی رہتی۔ بسا اوقات سوکھی ہوئی روٹیاں پانی میں بھگو بھگو کر اپنا اور بھوکے بچوں کے لیے آسرا مہیا کیا جاتا۔

ایک دفعہ پھر مکان کی تبدیلی کا معاملہ سامنے تھا۔ ان کے موجودہ رحمان کالونی والے مکان میں ان کی والدہ محترمہ نے بچوں اور بچیوں کو قرآنی تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کر دیا اور پھر یہ سلسلہ بڑی دیر تک چلتا رہا۔

اصغر مغل کے والد محترم کی وفات پر گھر کا انتظام مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ عدم ادائیگی فیس اصغر مغل کا نام سکول سے خارج کر دیا گیا۔ فرسٹ پوزیشن لینے والا طالب علم اپنی تعلیم کو مڈل سے آگے نہ لے جا سکا۔

اصغر مغل کے مدرسہ چھوڑنے اور ان کے والد محترم کی وفات کا سن 1969 بتایا جاتا ہے۔ جب کہ ان کی والدہ محترمہ ان کے والد محترم کی وفات کے 23 سال بعد تک زندہ رہیں۔ اصغر مغل اپنی آپ بیتی سنانے میں مصروف تھے اور ان کی آنکھوں میں پانی چھلکنے کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے ان کی زبانی پر مرحلہ وار اپنے چار اساتذہ کرام کا نام تھا۔ ایک نام ملک آرٹ دیپالپور روڈ والے، دوسرا نام صادق پینٹر جبکہ تیسرا اور چوتھا نام دو سگے بھائیوں سید زاہد حسین اور صابر حسین شاہ صاحبان کا ہے۔ انہی شاہ صاحبان کی کمال مہربانی نے اصغر مغل کی زندگی کا رخ ایک نئی سمت کی جانب موڑ دیا۔ دیپالپور روڈ پر جہاں آج کل پوسٹ آفس ہے۔ یہیں پر ہی شاہ صاحبان کا پینٹنگ ہاؤس ہوا کرتا تھا۔ خوش خطی کا فن بچپن ہی سے ان کے حصے میں آ چکا تھا۔ سکول چارٹ، سائن بورڈ، سینما بورڈ، دیواروں پر لکھنے کا کام، بجلی کے پنکھوں کی رنگائی، قلفیوں والی ریڑھیوں پر رنگ و روغن کا کام، چولہوں پر رنگ سازی کرتے ہوئے ہاتھوں کی انگلیوں سے رستا ہوا خون، پھر زخموں سے اٹھنے والی درد کی لذت انہیں آج تک یاد ہے۔ 1982ء میں وہ مسقط چلے گئے۔ وہاں فن مصوری کے معتبر حوالوں کے فن کاروں سے ملاقاتیں اور ان سے مختلف خطوط میں رہنمائی حاصل کی۔ ان رنگوں میں چھپے ہوئے بھیدوں کی جانکاری حاصل کی لیکن طبیعت میں ٹھہراؤ نہ ہونے کی وجہ سے واپس پاکستان تشریف لے آئے اور دوبارہ اوکاڑہ شہر کے کچہری بازار سے ملحقہ صرافہ بازار میں پینٹنگ کا کام شروع کر دیا گیا۔ ایک دن برسات کے جمع شدہ پانی میں برش کے چند چھینٹوں کے عمل نے ان کے دل و دماغ کے نقوش کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہیں سے ہی قرآنی آیات کے لکھنے کا عمل شروع ہوا۔ رنگوں کے حسین امتزاج سے ایسا نقشہ تیار ہوا جس کا ہر ہر منظر سمندر کی لہروں کی طرح کروٹیں لیتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

قرآنی آیات کے لکھنے کے عمل سے ان کی کشتی کے بادبان کا رخ مدینے کی جانب مڑتا چلا گیا۔ ان کی بے قرار سوچوں میں اگر کوئی شہر بسا ہوا ہے تو وہ شہر مدینہ ہے۔ بسا اوقات انہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مدینے کی فضاؤں میں گھوم رہے ہوں۔ شرافت کی دنیا کے مست ملنگ اصغر مغل کا جنت کی کیاریوں میں چہل قدمی کرنا، جیتی جاگتی آنکھوں سے جنت کے نظارے، درختوں کے پتوں پر بنے ہوئے جھولوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے مزے لوٹنے کا شوق ان کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔ ان کی آنکھیں بہت سے خواب دیکھ رہی ہیں۔ شب و روز یہی دعا مانگتے ہیں یاالٰہی میرے فن پارے مدینے بھی جائیں۔ گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کی طرف ان کی بڑھتی ہوئی کوششوں نے بغیر برش کے قرآنی خطاطی کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ مختلف جرائد اور اخبارات میں چھپنے والی خبروں سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ایک ٹیم ان کے کام کی تصدیق کے لیے پاکستان کا دورہ کرنے والی ہے۔ دیکھئے قسمت کی دیوی ان پر کب مہربان ہوتی ہے۔

کئی ممالک سے جاری ہونے والی ویب سائٹس ان کی شہرت کا ایک اور منہ بولتا ثبوت ہے۔ مختلف جرائد اور اخبارات میں ان پر لکھے گئے مضامین کی تعداد میں نت نئے انداز میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آج وہ دو سو سے زائد اعزازات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ سن 2010ء میں روزنامہ جنگ، نوائے وقت اور روزنامہ اساس ان کے نام اسلامی کیلنڈر کا اجراء کر چکے ہیں۔ روزنامہ نوائے وقت اور جنگ اخبار نے دوسری بار 2013ء اور 2014ء بشمول روزنامہ نئی دنیا کا اسلامی کیلنڈر ان کے نام کر کے انہیں بہت بڑے اعزاز سے نوازا ہے۔ جنگ اخبار نے رمضان استقبال کی صورت میں ایک اور اعزاز یہ بھی انہیں عطا فرمایا ہے۔ نیلام گھر، صدارتی سرٹیفکیٹ اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ہاتھ سے شیلڈ کی وصولی بھی ان کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔ ادھر ان کا قرآنی آیات کی خطاطی کا عمل جاری ہے۔ ادھر انشاء اللہ خدا کے حضور ان کے لیے سایہ دار درختوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہوگا۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ رنگ ایک آرٹسٹ کے حسن عمل کو نکھارنے میں ہمیشہ آگے آگے رہے ہیں۔ قرآنی خطاطی ہو، خشکی کے مناظر ہوں یا پھر تھل مرغابیوں کو تیرنے کا ہنر سکھایا جا رہا ہو وہ ایسی بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں۔ انہوں نے بغیر برش کے قرآنی آیات پر کام کر کے خود کو ایک انوکھے ہنر کے بانی ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ ان کا کہنا

ہے کہ وہ اپنے فن کو بیچتے نہیں بس صرف ہدیہ وصول کرتے ہیں۔ وہ قرآنی آیات کو کینوس کے اُفق پر اُبھارتے ہیں تو نور کے ہزاروں مناظر ان کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی ہزار سے زائد فن پارے ان کے ہاتھوں سے تخلیق ہو چکے ہیں۔ قرآنی خطاطی میں ان کے بغیر برش کے کیے گئے کام کی نمائش ملک اور ملک سے باہر بھی ہوتی رہتی ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کی طرف سے بخشی گئی پذیرائی پر بہت ممنون ہیں۔ وہ اس حدیث کے مفہوم کو اپنے ذہن میں رکھے ہوئے ہیں کہ روز قیامت بندہ جگہ سے ہل نہ پائے گا جب تک چار باتیں اس سے پوچھ لی جائیں گی۔ ایک اس کی عمر کہ کس کام میں گزاری اور دوسری اس کا علم اس پر کیا عمل کیا تیسری اس کا مال کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ چوتھے اس کا جسم کہ اس کو کس کام میں لایا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ لوگ پہاڑوں کی طرح اونچے اونچے اعمال لے کر جائیں گے لیکن جب ان کے اعمال تولے جائیں گے تو وزن صفر نکلے گا۔ یہ اللہ ہی ہے جس کے چاہے درجات بلند کر دیتا ہے۔ آج کا انسان کائنات کی حقیقتوں کو اُبھارنے کے نئے کمالات کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ان کا دل و دماغ قرآنی آیات کی روشنی میں ایسے فن پارے تخلیق کر رہا ہے جسے انسانی آنکھ دیکھتی بھی ہے اور پڑھتی بھی ہے۔ لوگ ان کے فن پارے تبرک کے طور پر بنگلوں، کوٹھیوں، دفاتر اور مکانات کی دیواروں پر آویزاں کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ کو بے چین کر دینے والا جوالا مکھی انہیں شہرت کی بلندیوں تک لے جا چکا ہے۔ اللہ کے نبی نے فرمایا ہے انسان کی قدر و قیمت علم کے اعتبار سے ہونی چاہیے۔ یہ علم اسلام کی حیات اور ایمان کا ستون ہے۔ انہوں نے جان لیا ہے کہ قرآنی آیات کا تعلق علم سے بھی ہے اور عمل سے بھی۔ وقت تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ سانسوں کے رک جانے کا لمحہ نہ جانے کب سر پر آ جائے۔ اصغر مغل کی دلی خواہش ہے کہ قرآنی خطاطی کا عمل ان کی نجات کا ذریعہ بن جائے۔ آمین ثم آمین

ایم آر شاہد (تمغہ امتیاز)
ایک تعارف

اصلی نام محمد ریاض شاہد ادبی نام ایم آر شاہد ولد محمد دین (مرحوم) 4 ستمبر 1961ء کو ہندوستان کے صوبہ مشرقی پنجاب کی آزاد ریاست مالیر کوٹلہ ضلع سنگرور میں پیدا ہوئے۔ تین جماعتیں اپنے آبائی علاقہ محلہ چور ماراں کے مسلم پرائمری سکول سنامی گیٹ سے پڑھیں۔ ستمبر 1969ء میں بھارت کو خیر باد کہہ کر اپنی والدہ محترمہ کے ہمراہ پاکستان چلے آئے۔ یہاں مزنگ لاہور میں سکونت اختیار کی اور ایم سی پرائمری سکول وارث روڈ لاہور میں تیسری جماعت میں داخلہ لیا اور 1973ء میں پرائمری پاس کی۔ اب یہاں سکول کی جگہ بلند و بالا عمارت گورنمنٹ میاں نواز شریف گرلز کالج واقع ہے۔ میٹرک کا امتحان 1978ء میں گورنمنٹ مزنگ ہائی سکول سے پاس کیا۔

27 اپریل 1981ء میں محکمہ پولیس میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس وقت اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔ ادبی سرگرمیوں کا آغاز اس سے قبل شروع کر چکے تھے۔ پھر ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنے علمی، ادبی ذوق کی تشکیل کے لیے ادبی حلقوں سے منسلک رہے۔ اردو اور پنجابی میں مختلف قومی اخبارات و ادبی جرائد میں مضامین، فیچر، انٹرویوز اور دیگر تحریریں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جو تاحال جاری ہے۔ ستمبر 2003ء میں پہلی کتاب ''لاہور میں مدفون مشاہیر'' جو لاہور کے ایک سو پانچ قبرستانوں کی تحقیق پر مبنی ہے شائع ہوئی۔ دوسری کتاب جولائی 2004ء کو ''شہر خموشاں کے مکیں'' منظر عام پر آئی جس میں اسلام آباد، راولپنڈی (ڈویژن) کی زمین کی آغوش میں سوئی ہوئی نامور ہستیوں کی تحقیق شامل ہے۔ تیسری کتاب فروری 2006ء میں ''شہیدان وطن'' کے نام سے مارکیٹ میں رونما ہوئی جس میں شہداء وطن کے حالات زندگی تحریر کیے گئے ہیں۔ جبکہ چوتھی کتاب ''لاہور میں مدفون مشاہیر (جلد دوم)'' اور پانچویں کتاب جنوری 2011ء کو ''شہدائے پنجاب پولیس'' شائع ہوئی۔ جبکہ چھٹی کتاب مارچ 2012ء میں ''کراچی میں مدفون مشاہیر'' شائع ہوئی۔ ساتویں کتاب سفر نامہ حج اشاعت 2013ء میں شائع ہوئی۔ مرکز علم و فن کے چیئرمین علاوہ ملک کی بہت سی ادبی تنظیموں کے رُکن عہدیدار ہیں جن میں (پریس سیکرٹری) ورلڈ پنجابی کانگریس، ممبر اکادمی ادبیات پاکستان، رُکن پاکستان رائٹرز گلڈ پنجاب، ممبر ادبی بیٹھک الحمراء لاہور شامل ہیں۔ 2011ء میں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ 14 اگست 2011ء کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے (تمغہ امتیاز) کا اعلان کیا جو 23 مارچ 2012ء کو یوم پاکستان کے موقع پر عطا کیا گیا۔ اب ان کی نظریں پورے پاکستان کی سرزمین میں آسودہ خاک خوبصورت ہستیوں کی تحقیق پر جمی ہیں۔

محبت کا وجدان

نصرت زہرا/کراچی

شہر سخن کی شہزادی پروین شاکر نے خوشبو کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "وجود کو جب محبت کا وجدان ملا تو شاعری نے جنم لیا۔ اُس کا آہنگ بھی وہی ہے جو موسیقی کا ہے۔ جب تک سارے سُر سچے نہ لگیں گلے میں نور نہیں اُترتا"

کچھ ایسا ہی تاثر نامور شاعر حسن عباسی کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں کے نام ہی ان کے نصب العین کا پتہ دیتے ہیں۔ "ہم نے بھی محبت کی ہے"، "ایک محبت کافی ہے" اور "اک شام تمہارے جیسی ہو" میں انہوں نے اس ایک جذبے کی سو طرح سے تہذیب کی ہے! ایک ایسے دور ابتلاء میں جب انسان کو اپنے سائے کا بھی اعتبار نہیں حسن کے خوشگوار شعری تجربوں کو شعری قالب میں ڈھالنے کی پیہم روایت سے حیرت دوچند ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں انہیں پروین شاکر ادبی ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

حسن عباسی نے نہ صرف شعری پیکروں کو روح شاعری بنایا جسے چھو کر دیکھا جا سکتا ہے تو دوسری جانب سچائی کو کسی لگی لپٹی میں رکھے بغیر صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے کی اعلیٰ روایت کو قائم بھی کیا ہے۔

ان کے ہاں بھی ابتدائے عشق کی جانکاہ وارداتیں موجود ہیں لیکن یہ تجربے زندگی سے بےزار نہیں بلکہ پیہم چاندنی کی تمنا کرتے ہیں۔ محض تلخ تجربات ہی ان کی شعری زمین کو استوار نہیں کرتے بلکہ بیادولین "When lips refused to kiss, begins to song" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ سفر چاندنی کی تمنا کرنے سے شروع ہوتا ہے اور کہیں سے زندگی کو بامقصد بنانے کا عمل بھی جاری وساری رہتا ہے۔

ایک تجسس کے اندھیاروں میں پھرتا ہوں\
مشعل ہاتھ میں لے کر غاروں میں پھرتا ہوں\
صدیوں پہلے کا اک شہر آباد ہے مجھ میں\
جس کی گلیوں اور بازاروں میں پھرتا ہوں\
مجھ سے پوچھے کوئی رنگ اور مٹی کیا ہے\
کیسے کیسے لالہ زاروں میں پھرتا ہوں\
ایسے پھرتا ہوں اس جنگل کے پیڑوں میں\
جیسے میں بچپن کے یاروں میں پھرتا ہوں\
پھر بھی ان سے سیکھ نہیں پاتا ہوں کچھ بھی\
سارا دن دنیاداروں میں پھرتا ہوں\
اپنے نام کی لاج حسن رکھنی ہوتی ہے\
پھول اٹھا کر میں تلواروں میں پھرتا ہوں

لیکن باعث حیرت تو یہ ہے کہ اتنے مرصع شعروں کے خالق کی پذیرائی اس طور پر نہیں کی گئی جس کے وہ صحیح معنوں میں حقدار تھے یا ہیں اوگرنہ ہمارے ہاں کچے پکے شعر کہنے والوں کو سرمہ چشم بنانے کی عجیب سی روایت چل پڑی ہے۔ اُن میں بعض شعراء کا تو حال یہ ہے کہ ان کے اشعار کو سیکنڈری اسکولز کے شعری مقابلوں کے معیار سے بھی کم تر قرار دے دیا جانا چاہیے۔ بہر حال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ دور پرآشوب ہے جہاں اچھی چیزوں کی قدر و قیمت کا احساس صرف اہل ذوق واہل علم ہی جانتے ہیں۔

محترم حسن عباسی کے دو سفرنامے بھی طبع ہو چکے ہیں جو اپنے ناموں کی طرح منفرد ہیں۔

"محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو" اور "ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا" بھرپور تخلیقی سفرنامے ہیں جنہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں نثر اور نظم میں یکساں قدرت حاصل ہے۔ عطیہ خداوندی یعنی تخلیق نے انہیں چاروں جانب سے آسودہ رکھا ہے۔

حسن عباسی کا اسلوب اگرچہ نیا نہیں بلکہ انہوں نے کلاسیکی اور جدت کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے اپنے لیے جگہ بنائی ہے اور کامیاب رہے ہیں۔

انہوں نے بھی ریاضتیں کی ہیں جاگ جاگ کر اپنے لیے لفظوں کی کائنات آسان ہونے کی بہت سی دعائیں خدائے بزرگ و برتر نے قبول بھی کی ہیں۔

یاد آنے والے بھی معجزے دکھاتے ہیں\
گھر میں سرخ آنکھوں کے پھول کھلتے جاتے ہیں\
عشق وہ سمندر ہے جس میں ڈوبنے والے\
ابر بن کے اُٹھتے ہیں لہر بن کے آتے ہیں\
صرف تیری آنکھیں ہی کھینچتی نہیں ہم کو\
یہ زمیں پکڑتی ہے آسماں بلاتے ہیں\
برتنوں سے ہاتھوں کے خوشبوئیں نہیں جاتیں\
خاک اوڑھنے والے روز یاد آتے ہیں

ہاں یہ بھی ہوا ہے انہوں نے سوچ کا حسن اور لہجے کی نرمی کے ساتھ اونچی آواز بھی اپنائی ہے۔

ہم کو دل سے جو شخص بھایا نہیں\
ہاتھ اُس سے کبھی ملایا نہیں\
تیری آنکھیں ترا تعارف ہیں\
میں یونہی پاس چل کے آیا نہیں

اور کہیں یہ لہجہ مکمل مزاحمت کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

بدلا نہیں بیان دباؤ کے بعد بھی\
قائم ہوں اپنی بات پہ گھاؤ کے بعد بھی\
اب تک جمے ہوئے ہیں زمیں پر مرے قدم\
سات آسماں کے نت نئے داؤ کے بعد بھی

غرض یہ کہ حسن عباسی کے ہاں جو کچھ بھی ہے اور جیسا ہے ویسا ہی شعر کے پیرائے میں بیان کر دیا جاتا ہے لیکن کہیں بھی فنی حُسن متاثر نہیں ہوتا۔ بلاشبہ وہ پاکستان کے نوجوان شعراء میں خاص مقام رکھتے ہیں لیکن چونکہ ہمارے ہاں میرٹ کا قتل عام ہوئے کئی سال بیت گئے سو ایسے میں اتنے خوبصورت شعر کہنے والے تخلیق کار کو صرف ذہنی کرب سے ہی گزرنا پڑتا ہے۔ انہیں داد وہی دے سکتے ہیں جو اہل نظر میں اہل ادب و دانش ہیں۔ یقیناً ایسے اچھے شعروں کے ساتھ یہ بےانصافی دکھ دیتی ہے۔

محترم جناب حسن عباسی کو ابھی بہت دور جانا ہے لیکن ان کا جاری سفر بھی کچھ ایسا ہے کہ جس میں دو رویہ گلابوں کے تخت بچھے ہیں۔

اللہ کرے زور قلم کم نہ ہو کبھی

متفرق شاعری

پڑھنے کو بے نظیر اصولوں سے بھر گئے
سنتے ہیں اپنے گاؤں سکولوں سے بھر گئے
برسات سے نہال ہیں پیڑوں کی ڈالیاں
آموں کے باغ سارے ہی جھولوں سے بھر گئے
کانٹے چنے جو ہم نے تو افتاد یہ پڑی
رستے کڑے سفر کے بگولوں سے بھر گئے
یہ بچپنے کے کھیل تماشے عجیب ہیں
بچوں کے ہاتھ پاؤں بھی دُھولوں سے بھر گئے
کانٹے بکھرتے جائیں گے دانوں کے درمیاں
اطراف کھیتیوں کے بگولوں سے بھر گئے
گھر سے ہمیں نکلنا ہے منتظر ہے کوچ کا
ثاقب قریب و دور ہیں پھولوں سے بھر گئے

آصف ثاقب/ایبٹ آباد

آبِ حیات پی تو لیا ہے خوشی خوشی
اب سوچتا ہوں کیسے گزاروں گا زندگی
مہلک ہے کتنی روشنی عہد جدید کی
آنکھوں کو خیرہ کر گئی دل تک نہ جا سکی
جامع نہ ہوگا تبصرہ میرا کیا ہوا
میں نے کتاب زندگی پوری نہیں پڑھی
کتنے ہی پیچھے رہ گئے خونخوار بھیڑیے
آگے کہیں نکل گیا وحشت میں آدمی
ہوتا ہے روز ہم سے نہتوں کا سامنا
کس نے درندے چھوڑ دیے ہیں گلی گلی
فاقہ کشی پہ بھی کوئی قدغن لگایئے
سنگین جرم ٹھہرا ہے اقدام خودکشی

بادِ صبا کا بس ذرا نصرت نہیں چلا
سر سر اڑا کے لے گئی پھولوں سے تازگی

نصرت صدیقی/فیصل آباد

یہ کیسے خوف کی پرچھائیوں میں زندہ ہوں
کہ اپنے گھر میں ہوں اور بھائیوں میں زندہ ہوں
فریب ماضی و آئندہ بھی ہے خوب مگر
گزرتے لمحوں کی دانائیوں میں زندہ ہوں
اسیر زلف معطر ہوں ایک مدت سے
شب سیاہ کی رعنائیوں میں زندہ ہوں
کبھی حیات کا نغمہ سنا نہیں پورا
کہ زندگی تری استھائیوں میں زندہ ہوں
یہ بام و در تو مرا سانس روک لیتے ہیں
سو اپنی ذات کی پہنائیوں میں زندہ ہوں
اڑائے پھرتی ہے مجھ کو کراں کراں ناصر
میں اپنی فکر کی انگڑائیوں میں زندہ ہوں

ناصر علی سید/پشاور

سب پرندے شجر سے اُڑ گئے ہیں
جتنے تھے آشیاں اُجڑ گئے ہیں
رتجگوں میں جو ہم نے دیکھے تھے
خواب تعبیر سے بچھڑ گئے ہیں
کیا بتائیں کہ کیسے اُجڑے ہیں
مختصر یہ کہ ہم اُجڑ گئے ہیں
پھیلتے جا رہے ہیں شہر یہاں
میرے گاؤں بھی سکڑ گئے ہیں
اب تو نفرت سے ہم کو نفرت ہے
ہم محبت کے ساتھ جڑ گئے ہیں
جانے کیسی بہار آئی ہے
پھول شاخوں سے سارے جھڑ گئے ہیں
موڑ کیسا یہ آ گیا ہے جلیل
سیدھے رستے کدھر کو مڑ گئے ہیں

احمد جلیل/اوکاڑہ

یادگزیدہ

مجھے یادوں سے نفرت ہے
کہ یادیں زندگی کی راہ کو مشکل بناتی ہیں
طبیعت جب کبھی شاداب ہو، دل گنگناتا ہو
اگر ایسے میں ماضی کا کوئی پل، کوئی لمحہ یاد آ جائے
تو منہ کا ذائقہ کڑوا کسیلا لگنے لگتا ہے
وہ یادیں جب بھی آتی ہیں انا مجروح ہوتی ہے
اور آنکھیں اک بیاباں کا سا منظر پیش کرتی ہیں
جسے میں نے بڑی مدت میں محنت سے سمیٹا تھا
وہی شیرازۂ جاں پھر بکھر جانے کو ہوتا ہے
کوئی صورت ہو میرے ذہن کا در بند ہو جائے
جہاں بوسیدہ یادوں نے کسی غربت کی صورت سے
پنجے گاڑ رکھے ہیں
مجھے یادوں سے نفرت ہے
کہ میرے پاس یادوں کے بہت محدود عنواں ہیں

حجاب عباسی/کراچی

متفرق شاعری

سوشل میڈیا

یہاں ہے لمحہ موجود اپنا
یہاں اوراق ماضی کے پڑے ہیں
کہاں کہنے کو اب کچھ رہ گیا ہے
خبر کی آخری حد تک گئے ہیں
ملاقاتیں بھی لکھی جا رہی ہیں
دلوں کے بیچ تھیں جو راز جیسی
وہ سب باتیں بھی لکھی جا رہی ہیں
میری تصویر اُس کے سامنے ہے
پتہ اُس کا مجھے ازبر ہوا ہے
صداؤں کی رِدا پہنے ہوئے ہو
خبر رکھنا ذرا دیدہ وروں کی
کہ وہ اک آنکھ، جو سب دیکھتی ہے
اُسے تفصیل جو بھی چاہیے تھی
وہ سب ترسیل اُس تک ہو گئی ہے

فرحت زاہد/لاہور

چاند کے ساتھ ستارے جو بکھر جاتے ہیں
کہاں جاتے ہیں یہ ہر صبح کدھر جاتے ہیں
شہر لوگوں سے ہوا جاتا ہے خالی خالی
باندھ کر جانے کہاں رختِ سفر جاتے ہیں
کل کی تو بات ہے سب پاس رہا کرتے تھے
لمحے خوشیوں کے بڑی جلدی گزر جاتے ہیں
میرے معیار پہ جو پورا اُترتے ہی نہیں
رفتہ رفتہ وہ مرے دل سے اُتر جاتے ہیں
اتنا روتی ہوں ستارہ میں کسی کی خاطر
سپنے آنکھوں میں مری ڈوب کے مر جاتے ہیں

شکیلہ ستارہ/واہ کینٹ

پہلے تو آگ خواب کے خاشاک پر اُتار
پھر اُس کی راکھ دیدۂ نمناک پر اُتار
گردش کے ساتھ لازمی ہے ٹوٹ پھوٹ بھی
جس سے جدا نہ ہو سکوں اُس چاک پر اُتار
میں چاہتا ہوں زخم کو بیگانہ درد سے
ایسی کوئی خوشی دلِ غم ناک پر اُتار
آئینہ آئنے کی حکایت سمجھ سکے
مجھ سا کوئی مرے لیے اس خاک پر اُتار
چاہت نہیں تو رشتہ نفرت ہی مجھ سے رکھ
جب گُل نہیں تو داغ ہی پوشاک پر اُتار
لازم ہے اس تھکن میں مری گھر کو واپسی
مجھ خاکِ بے دیار کو افلاک پر اُتار
میں شاذؔ بے خیال تجھے چاہوں کب تلک
کوئی تو نقش صفحۂ ادراک پر اُتار

شجاع شاذ/سیالکوٹ

تمہی سے ہے قائم حکومت ہماری
تمہی ہو تمہی ہو محبت ہماری
کوئی خاک سمجھے طبیعت ہماری
جدا ہے زمانے سے عادت ہماری
تمہیں فرصتوں میں ہی سوچا ہے ہم نے
بڑے کام کی ہے یہ فرصت ہماری
یقیں ہے ہمیں ایک دن دیکھ لینا
ترے دل میں ہوگی سکونت ہماری
نہ کچھ دیکھنے کی ضرورت رہے گی
اگر دیکھ لیں آپ حالت ہماری
جسے روز و شب یاد کرتے رہے ہم
بھلا دی اُسی نے ہی صورت ہماری
بدل جائے دنیا بدل جائیں حالات
نہ بدلی نہ بدلے گی فطرت ہماری
کبھی ہم کو یوں چھوڑ کر وہ نہ جاتے
اگر اُن کو ہوتی ضرورت ہماری
بہت ہم نے چاہا مگر زندگی میں
چھٹی ہم سے جابرؔ نہ غفلت ہماری

جابرؔ نظامی

ہوا چلتی ہے، دل کہتا ہے کب ان سے ملیں گے
بدن سے جاں نکل جائے گی تب ان سے ملیں گے
تمہیں تو خیر دل کی بات کہنی ہے کسی طور
مگر کچھ لوگ ہیں جو بے سبب ان سے ملیں گے
بہت خوش ہیں کہ نظارہ کریں گے، دید ہوگی
نظر کیسے ملا پائیں گے جب ان سے ملیں گے
یہی احساس کھائے جا رہا ہے جان و دل کو
کہ سر پر برف اُتر آئی اور اب ان سے ملیں گے
ہوئے تھے میرؔ بھی رسوا محبت میں کسی وقت
بھلا کر ہم بھی اب نام و نسب ان سے ملیں گے
حسنؔ ملنے کی خواہش تو رہی ہے عمر بھر سے
بکھر جائیں گے سارے خواب جب ان سے ملیں گے

حسن جمیل/واہ کینٹ

گلے کیا ہیں دل کے سنے تو نہیں نا
کہ جاتے ہوئے تم ملے تو نہیں نا
تمہیں کیا پتہ شب گزرتی ہے کیسے
کبھی رات بھر تم رُکے تو نہیں نا
تہی دست لوٹا ہوں بازار سے میں
وفاؤں کے سکے چلے تو نہیں نا
شجرکاری صحرا میں کرتا رہا ہوں
کہ چاہت کے پودے اُگے تو نہیں نا
تمہیں رو کے مانگا تھا میں نے خدا سے
مناجات سے تم ملے تو نہیں نا
لبوں کی منڈیروں پہ بیٹھے ہوئے تھے
دعاؤں کے پنچھی اُڑے تو نہیں نا
شب و روز میں کچھ تغیر ہے ارشد
جدا ہو کے دونوں مرے تو نہیں نا

ارشد محمود ارشد/سرگودھا

گر جاؤں کبھی میں تو اُٹھانے نہیں آتے
کچھ لوگ مدد کے بھی بہانے نہیں آتے
قسمت کے خفا ہونے کا انجام یہی ہے
رستے میں کہیں میرے ٹھکانے نہیں آتے
یہ پیاس لب دریا جو لے جاتی ہے رن میں
تو لوٹ کے واپس کبھی شانے نہیں آتے
تم ساتھ جو ہوتے تو بتاتا میں تمہیں سب
کوسوں سے مجھے حال بتانے نہیں آتے
تو لاکھ قفس میں ہی پٹختا رہے سر کو
طائر تو کبھی تجھ کو چھڑانے نہیں آتے
افلاس کی گردش ہے کہ راتوں کو مری اب
یہ چاند ستارے بھی سجانے نہیں آتے
اخلاص کے امرت نے جلا ڈالا ہے مجھ کو
راحت کے کبھی دل میں زمانے نہیں آتے

دشمن نے جو توڑا ہے تعلق تو بچا کیا
خوابوں میں بھی اب مجھ کو ڈرانے نہیں آتے

وسیم عباس/لاہور

نظر سے ملا کر نظر بولتا ہے
نہیں بولتا وہ مگر بولتا ہے
مری منزلوں نے ہے چپ سادھ رکھی
ارادہ سفر در سفر بولتا ہے
یہ چرچے نہیں باعث حسن صورت
مرے عشق ہی کا اثر بولتا ہے
بظاہر لبوں پہ نہ آہیں نہ سسکی
مگر اُس کا دیدۂ تر بولتا ہے
دیار محبت میں سر اپنا عالم
میں جس جا جھکاؤں وہ در بولتا ہے

وسیم عالم/گوجرانوالہ

ترے وجود کا اقرار میں کروں نہ کروں
ترے وجود سے انکار ہو نہیں سکتا
یہ اور بات ہے دستک دیے بنا نہ کھلے
مگر وہ در کبھی دیوار ہو نہیں سکتا

احمد سبحانی آکاش/لاہور

اس کے گھر میں آگ لگی ہے
اس کے گھر میں آگ لگی ہے
پیٹ کی آگ کو چھوڑو صاحب
میرے سر میں آگ لگی ہے

نیازت علی نیاز/مانسہرہ

کینیڈا میں مقیم اُردو اور پنجابی کی
معروف شاعرہ تن دیپ تمنا کا
اُردو شاعری کا پہلا مجموعہ
''پہلا گیت محبت کا''
خوبصورت اور دیدہ زیب گیٹ اپ میں
شائع ہو گیا ہے
نستعلیق مطبوعات
F-3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اردو بازار،
لاہور 042-7351963

نیویارک امریکہ میں مقیم پنجابی کے
نامور شاعر سرندر سوہل کا
پہلا پنجابی شعری مجموعہ
شیشے تے کھِڑ دے پھُل
خوبصورت اور دیدہ زیب گیٹ اپ میں
شائع ہو گیا ہے
نستعلیق مطبوعات
F-3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اردو بازار،
لاہور 042-7351963

ڈاکٹر اللہ رکھا مرحوم!

عطاءالحق قاسمی

ڈاکٹر اللہ رکھا مرحوم ایک زمانے میں میرے ہمسائے تھے۔ مرحوم ان کا تخلص نہیں تھا بلکہ انہوں نے یہ لفظ نام کا حصہ محض اس لیے بنا رکھا تھا تاکہ انہیں اور ان کے مریضوں کو موت ہمیشہ یاد رہے۔ مرحوم کے قریبی دوستوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے ایم بی بی ایس کی ڈگری اوکاڑہ یونیورسٹی سے لی تھی۔ جو ان کے والد گرامی نے ڈھائی مرلے کی وسیع و عریض عمارت میں قائم کر رکھی تھی۔!

ڈاکٹر صاحب مریض کو دیکھتے ہی مرض کا اتا پتا بتا دیتے تھے اس معاملے میں انہیں یدطولیٰ حاصل تھا' میری موجودگی میں ایک مریض ان کے پاس آیا' ڈاکٹر صاحب نے ایک نظر اسے دیکھا اور کہا'' میرا خیال ہے تم بیمار ہو' اور پھر انہوں نے فاتحانہ نظروں سے میری طرف دیکھا کیونکہ وہ شخص واقعی بیمار تھا۔ دوسرے مرحلے پر ڈاکٹر صاحب نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا'' کیا کشمیر کی صورت حال میں کوئی تبدیلی آئے گی؟'' میں نے جواب نہیں دیا تاکہ گفتگو ان کی صحیح تشخیص میں رکاوٹ کا باعث نہ بنے، وہ سمجھے شاید اس معاملے میں میری معلومات ناقص ہیں چنانچہ انہوں نے دوسرا سوال پوچھا'' بکر منڈی میں بکروں کی قیمتیں کیسی جا رہی ہیں؟'' مجھے ان کے سوال پر بہت غصہ آیا' میں نے جھنجلا کر کہا'' آپ عام بکروں کے بارے میں پوچھ رہے ہیں یا بوبکروں کے بارے میں؟ بوبکرے تو بہت سستے ہیں، دوسرے بکرے مہنگے ہیں۔ لیکن آپ یہ پوچھ کیوں رہے ہیں؟'' بولے'' بخار ہے'' اس دفعہ ان کا مخاطب وہ مریض تھا جو یقیناً اس حیرت انگیز تشخیص پر ڈاکٹر اللہ رکھا کی حکمت کا قائل ہو گیا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے دوا دی اور وہ ہنستا کھیلتا سیٹیاں بجاتا ہوا کلینک سے چلا گیا۔ ایک ہفتے بعد اس کے لواحقین اسے اسٹریچر پر ڈال کر ڈاکٹر صاحب کے پاس لائے، لگتا تھا اس کا آخری وقت آ گیا ہے' ڈاکٹر صاحب نے اس سے پوچھا'' میں نے تمہیں جو دوا دی تھی، وہ تم نے کس سے کھائی تھی؟'' اس نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا'' دودھ سے'' ڈاکٹر اللہ رکھا نے یہ سن کر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور کہا'' میں کہوں تمہاری یہ حالت کیوں ہو گئی ہے، دوا دودھ سے نہیں، پانی سے کھانا تھی!'' علاج میں یہ نزاکتیں ڈاکٹر اللہ رکھا ہی کا خاصہ تھا!

ڈاکٹر اللہ رکھا انسانوں کے علاوہ جانوروں کا علاج بھی پوری سنجیدگی اور مہارت سے کرتے تھے، اکثر اوقات دوائیاں خلط ملط ہو جاتیں یعنی غلطی سے انسانوں کی دوا کسی جانور کو اور جانور کی دوا کسی انسان کو دے ڈالتے، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب بھی ایسا ہوا مریض ٹھیک ہو گیا' ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں ان کی پوری زندگی میں جتنے مریض بھی شفایاب ہوئے وہ صرف اسی صورت میں ہوئے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے:

ڈاکٹر اللہ رکھا صرف طب اور حکمت ہی میں مہارت نہیں رکھتے تھے بلکہ سینیٹری کا کام بھی جانتے تھے میرے سوئی گیس کے چولہے اور نلکا وغیرہ ڈاکٹر صاحب ہی ٹھیک کرتے تھے، اگر کبھی گٹر میں کوئی رکاوٹ آ جاتی تو یہ ڈاکٹر صاحب کی عظمت تھی کہ اس رکاوٹ کو دور کرنے میں بھی انہوں نے کبھی عار محسوس نہیں کی چنانچہ ہمارے محلے میں ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے صفائی کی حالت بہت مثالی تھی، وہ تو ایک بدباطن عطائی نے ایک دن ان کے کان میں یہ بات ڈالی کہ اگر محلے میں صفائی کا نظام اسی طرح بہتر رہا تو لوگ بیمار نہیں ہوں گے اور اگر وہ بیمار نہیں ہوں گے تو ہم تم کھائیں گے کہاں سے؟ بس اس دن سے ڈاکٹر صاحب نے اس کام سے ہاتھ کھینچ لیا بلکہ دو ایک دفعہ تو یوں بھی ہوا کہ محلے والوں نے اصرار کیا۔ تو انہوں نے ٹھیک کرنے کی بجائے ڈکا اور زیادہ پھنسا دیا!

ڈاکٹر اللہ رکھا مرحوم حکمت اور سینیٹری کے کام کے علاوہ ایک اخبار میں کالم بھی لکھتے تھے، وہ خود کو کالم نگار کہتے تھے مگر لوگ انہیں'' گالم نگار'' قرار دیتے تھے کیوں کہ ان کے'' کالم'' میں گالیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا اور یہ گالیاں وہ انہیں نکالتے تھے جو ان کی حکمت اور سینیٹری کے کاموں میں مہارت سے انکاری ہوتے تھے اور یا پھر ان کو جو، ان کی کالم نگاری کو'' گالم نگاری'' قرار دیتے تھے، آخری عمر میں مرحوم نے داڑھی رکھ لی تھی اور پگڑی باندھنا شروع کر دی تھی، اب وہ گالیاں بہت دیتے تھے بلکہ منہ زبانی ہر ایک کو'' تباہ کر دوں گا برباد کر دوں گا'' کی دھمکیاں دیتے تھے لیکن انسان فانی ہے، وہ خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے ہوئے خواہ جتنے بڑے بڑے دعوے کرے ایک دن خود اس کے فانی جسم نے تباہ ہو جانا ہے چنانچہ ڈاکٹر اللہ رکھا بھی ایک دن ایک عام آدمی کی طرح فوت ہو گئے!

ڈاکٹر صاحب کی وفات کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہر انسان نے فوت ہونا ہی ہوتا ہے مگر دوسری اور فوری وجہ اپنے استاد کی نصیحت پر عمل نہ کرنا تھی، استاد نے پیش گوئی کی تھی کہ اللہ تمہارے ہاتھ میں شفا دے گا اور نصیحت یہ کی تھی کہ اپنی دوا خود کبھی نہ کھانا، استاد کی پیش گوئی تو متنازعہ رہی مگر نصیحت پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ سامنے آ گیا، رات کو طبیعت خراب ہوئی، انہوں نے اپنا مرض خود تشخیص کیا اور اپنی ہی تجویز کردہ دوا کھائی اور سو گئے تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ ہمیشہ کے لیے سو گئے ہیں، اہل محلہ نے ان کی نماز جنازہ میں کثیر تعداد میں شرکت کی ان میں سے بیشتر لوگ جنازے کے آگے آگے بھنگڑا ڈال رہے تھے!

''جی الانہ سے حسن عباسی تک''

حافظ مظفر محسن

''مجھے جی الانہ یاد آ گئے......''

میں جب بھی کوئی سفر نامہ پڑھتا ہوں میرا دھیان اُس نہایت ''جابر'' سفرنامے کی طرف چلا جاتا ہے۔ جو اُنہوں نے آج سے ساٹھ سال پہلے لکھا تھا جب وہ یو۔این۔او میں پاکستان کے مندوب کے طور پر رہے۔ ویسے جی الانہ نے قائداعظمؒ پر بھی اِک شاہکار کتاب انگریزی زبان میں بھی لکھی ہے جو بچوں کے نصاب میں پڑھائی جاتی ہے۔

آج کے نوجوانوں کو اس بات کا قطعی اندازہ نہیں ہو سکتا کہ آج سے چالیس سال پہلے جوان ہونے والے پاکستانی لڑکے لڑکیاں بھی اپنی جوانی کو اُن ہی کی طرح ''انجوائے'' کرتے تھے۔

آج کا نوجوان ''ماما'' کے آ جانے پر کمپیوٹر کا ایک ''ٹچ'' کرتا ہے اور ''سین (منظر)'' آف ہو جاتا ہے۔ ہم لوگ ''پلے بوائے'' یا پھر ''شمع رسالہ'' بڑی سی کتاب کے درمیان رکھ کر پڑھتے ہوئے جب محسوس کرتے کہ ''ماں جی'' آ رہی ہیں تو ہم ''پلے بوائے'' یا شمع رسالہ بند کر دیتے اور یوں لگتا...... جیسے نظریں کتاب پر ہی ہیں اور نیوٹن کا تیسرا قانون رٹ رہے ہیں...... جب کہ ہمارے زمانے میں ''ماں جی'' کو پتہ چل جاتا تھا کہ بیٹا کیا گل کھلا رہا ہے اور آج کی ''ماما'' بھی سمجھ جاتی ہے کہ اِک ٹچ نے کیا سے کیا کر ڈالا ہے!۔ یہ ٹچ سسٹم کچھ اچھا بھی کر رہا ہے اور اِک ٹچ ایٹم بم بھی گرا سکتا ہے!۔

جی الانہ کی کتاب (سفرنامے) نے بھی اس دور میں پڑھنے والوں پر خوب بمباری کی...... دلوں کو گرمایا۔

غلام علی الانہ...... کراچی کے رہنے والے تھے اور اردو کے بہت اچھے لکھاری بھی...... پچاس کی دہائی میں جی الانہ نے جب کراچی سے نیویارک سفر کیا تو اُن کے سامنے بہت سے دلکش خواب تھے۔ اپنے اس سرکاری فریضہ کی ادائیگی کے دوران جی الانہ نے نیویارک کے ''نائٹ کلب'' دیکھے کہ جہاں ینگ لڑکے اپنی دلکش دوستوں کے ساتھ میوزک انجوائے کرتے اور شراب کی چسکیاں لیتے۔

یہ پاکستانی نوجوان وہاں اُس ایئر ہوسٹس سے بھی ملا کہ جو کراچی تو نیویارک کی فلائٹ میں اُن کے ساتھ تھی...... اُس دور کی لڑکیوں کا اک غیر ملکی نوجوان کے ساتھ اس درجہ ''فرینک'' ہونا...... ہم نے بار بار پڑھا اور ہر بار دانتوں میں انگلی اس زور سے دبی کہ چیخ نکل گئی۔

چیخ تو جی الانہ کی بھی نکل گئی تھی جب اک نائٹ کلب میں اِن کو غصے میں اک نیگرو نے پنچ مارا...... اِک لمبے قد کے نیگرو نے محض اس لیے کہ اُس نیگرو کی گرل فرینڈ نے...... جب دونوں اِک تیز دھن پر رقص کرتے کرتے تھک گئے اور جی الانہ کی ٹیبل کے پاس سے گزرتے ہوئے لڑکی نے جی الانہ کو محبت سے ''کس'' کر ڈالا...... اور وہ نیگرو برداشت نہ کر سکا!۔ حالانکہ خود وہ اس حرکت کو ہرگز ہرگز معیوب نہیں سمجھتے تھے۔

حالانکہ ناقدانہ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں بے چارے جی الانہ کا تو کوئی قصور نہ تھا...... قصور تو ویسے اُس حسینہ کا بھی نہیں تھا...... لیکن مقدر کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔

میں نے جی الانہ کا یہ سفرنامہ تقریباً پچاس بار پڑھا یہاں تک کہ اُس کے صفحات ٹکڑوں سے پھٹ گئے۔ ایسے ہی ''گوروں کے دیس میں'' کا پہلا ایڈیشن بھی میرے پاس محفوظ...... سفرنامے تقریباً اِک جیسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں مگر فرق ہے...... سنجیدگی اور مزاح کا...... جی الانہ اپنی طرف سے سنجیدہ ہیں مگر فرق ہے...... سنجیدگی اور مزاح کا...... جی الانہ اپنی طرف سے سنجیدہ سفرنامہ لکھ گئے مگر میں نے ہر سطر کو انجوائے کیا...... ہر صفحے کو دل لگا کر پڑھا...... اور ہنستا رہا...... جہاں جہاں جی الانہ کی ''نیگرو'' کے ہاتھوں کم بختی آتی...... میں پڑھتے پڑھتے ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو جاتا...... جب کے ''گوروں کے دیس میں'' کا خالق عطاء الحق قاسمی...... تو ہمیں بچپن سے ہی گدگدا رہا ہے۔ اُنہوں نے شاید سنجیدہ ادب تخلیق کیا ہو مگر...... ہم ہنستے رہے کھلکھلاتے رہے۔

آج بھی میری لائبریری میں ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' کے اوپر جی الانہ اور عطاء الحق قاسمی کے دونوں سفرنامے اپنی اصلی حالت میں پڑے ہیں کہ یہ تینوں کتابیں سدا بہار ہیں اور تینوں لکھاریوں نے سچ لکھا اور ذرا برابر بھی ''سرخی پاؤڈر'' کا سہارا نہیں لیا۔

پھر ''سرخی پاؤڈر'' کا سہارا لیے...... سفرنامہ نگار سامنے آگئے...... میں یہاں مستنصر حسین تارڑ صاحب کی بات نہیں کررہا...... ویسے اُن کا انداز بتاتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کی ہیروئن بھی ڈالتے ہیں اور اُس کا بہت بڑے بیوٹی پارلر سے میک اپ کرواڈالتے ہیں۔

یہاں بیچ میں اک اور سفرنامہ میرے ہاتھ آیا جو میرے گھر میں ہر دور میں پڑھا جاتا رہا ہے...... 80ء کی دہائی میں عطاء الحق قاسمی نے ''نوائے وقت'' ادبی ایڈیشن کا آغاز کرکے اک نئی تاریخ رقم کی تو آہستہ آہستہ سبھی اخبارات نے اس روایت کو اپنالیا...... پہلے ادبی ایڈیشن میں اُنہوں نے انور مسعود کا اِک قطعہ...... اپنا اک کالم اور رحیم گُل کے ناول ''جنت کی تلاش'' کا اک حصہ شائع کیا جو ادبی دنیا میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ میں نے رحیم گُل کے ناول جنت کی تلاش کا یہ باب پڑھا تو اردو بازار چلا گیا...... عاشق جیسے اپنی محبوبہ کا پیچھا کرتے ہیں۔ میں بھی بہت گھوما پبلیشرز نے بتایا کہ رحیم گُل فلمی کہانیاں لکھتے ہیں کوہاٹ کے رہنے والے ہیں اُن کا یہ ناول ابھی چھپا نہیں۔

آخر کافی عرصہ بعد یہ ناول چھپ کر بازار میں آگیا اور میں نے اس کی بیسیوں کاپیاں خرید کر دوستوں/دشمنوں میں تقسیم کرڈالیں۔ دوستوں میں اس لیے کہ اس میں محبت کا درس تھا...... دشمنوں میں، میں نے یہ کاپیاں اس لیے تقسیم کیں!۔ یہ آپ میرے دشمنوں سے خود پوچھ لیں!۔ اگر آپ کو میرا کوئی دشمن مل گیا...... تو شاید وہ اس کی تفصیل آپ کو بتاسکے۔

رحیم گُل کا جنت کی تلاش اک شاہکار سفرنامہ ہے۔

شاہکار سفرنامے تو ہمارے ایک سینئر لکھاری نے بھی لکھے تھے مگر اپنے سامنے بھارت کا ''ریلوے ٹائم ٹیبل'' رکھ کر...... اُن کے یہ سفرنامے بڑے دلچسپ تھے اُن میں مشکوک پن جھلکتا تھا جب بھارت کے چھوٹے بڑے قصبوں گاؤں دیہات کا وہ کثرت سے ذکر کرتے تھے...... بہرحال سفرنامہ اُس وقت تک بہت زیادہ نہیں لکھا گیا تھا۔ اِس لیے لوگوں نے خوب دلچسپی سے پڑھا۔ اور ہر وقت نئی قسط کے انتظار میں رہے۔

میں اس وقت خوش ہوا جب مجھے آپا عابدہ چوہدری نے حسن عباسؔی کا پہلا سفرنامہ یہ کہہ کر پیش کیا...... کہ ''محسن ضرور پڑھنا شرارتی تحریر تو ہے ہی...... معلوماتی بھی بہت ہے''۔ میری مراد ''محبت کے گلے میں گھنٹیاں باندھو......!''۔

میں نے جب حسن عباسی کا یہ سفرنامہ سٹارٹ کیا تو مجھے جہاں ''گوروں کے دیس میں'' یاد آنے لگا وہیں مجھے جی الانہ بھی یاد آگئے...... کہ حسن عباسؔی کا بچپن کراچی میں گزرا تھا...... اس لیے شاید جی الانہ کا سا انداز بھی تھا اور عطاء الحق قاسمؔی سے تو وہ ویسے ہی متاثر ہے اس لیے شرارت بھی جھلک رہی تھی۔

میں حسن عباسؔی کے سفرناموں سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اب میرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر جہاں ''گوروں کے دیس میں......'' ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' اور ''جنت کی تلاش'' پڑے ہیں وہیں ساتھ ہی ''محبت کے گلے میں گھنٹیاں باندھو'' بھی موجود ہے۔ کہ رات سونے سے پہلے...... میں ان سفرناموں کی ورق گردانی ضرور کرتا ہوں کہ اچھی تحریر پڑھنے سے اچھے خواب آنے کی اُمید ہوتی ہے؟''۔

القمر انٹرپرائزرز کی نئی مطبوعات

تنقیدات تحسین فراقی مرتب: اشتیاق احمد

جناب تحسین فراقی کے بلند پایہ مضامین کا عمدہ انتخاب۔ قیمت 700 روپے

رقعاتِ مشفق خواجہ بنام ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر طاہر تونسوی

ڈاکٹر خالد ندیم نے مشفق خواجہ مرحوم کے مکاتیب کو مرتب کرکے ایک قیمتی ذخیرے کو محفوظ کردیا۔

قیمت-/250

نیا افسانہ اور قاری

ڈاکٹر طاہر تونسوی

اُردو افسانے پس اور پیش منظر قیمت-/250

محسن ملت چوہدری محمد علی

قیوم نظر چوہدری

تحریک پاکستان کے رہنما، سابق وزیراعظم چوہدری محمد علی کی سوانح اور جدوجہد پر ایک خوبصورت کتاب۔

انتخاب۔ قیمت 250 روپے

داستانِ اقبال

آمنہ صدیقہ

طلبہ و طالبات کے لیے علامہ اقبال کی سوانح حیات سادہ، عام فہم زبان و بیان کے ساتھ نوجوان نسل کے لیے عمدہ کتاب قیمت: 300

مزاح راہ

علی رضا احمد

''ذرا سی آں'' اور ''ایرے غیرے'' کے بعد نیا مزاحیہ مجموعہ

قیمت 300 روپے

غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

اردو نے غیر مرئی طور پر عوام کو آپس میں منسلک کر رکھا ہے☆ ڈاکٹر علی محمد خاں

اپنے اشعار میر، غالب اور مولا حالی کے مقابلے میں پھُس پھُسے لگے تو شعر کہنا چھوڑ دیا

سیاحت کا بہت شوق ہے۔ مشتاق یوسفی اور انتظار حسین بہت پسند ہیں☆ عامر بن علی کے ساتھ خصوصی گفتگو

(بقیہ انٹرویو ڈاکٹر محمد علی) میری ولادت پانی پت، ہریانہ (انڈیا) میں ہوئی تھی۔ ہجرت کر کے پاکستان کیسے پہنچے، یہ ایک لرزہ خیز مگر بنی برحقیقت داستان ہے جسے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جب ہم پانی پت سے لٹے پٹے خراب حال بادامی باغ (لاہور) کے رفیوجی کیمپ میں پہنچے تو سترہ دن تک حواس باختہ وہیں پڑے رہے۔ سخت سردیاں تھیں، مجھے خواب کی طرح یاد ہے کہ میں اپنی ماں کے ہمراہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پڑے ہوئے پتھر کے کوئلے چنا کرتا تھا۔ شام تک سات آٹھ سیر کوئلے اکٹھے ہو جاتے جن میں سے تھوڑے بہت تو ہم کیمپ میں آگ تاپنے کے لئے رکھ لیتے اور زیادہ مقدار میں بیچ دیتے، جس سے سات آٹھ آنے روز مل جاتے کیمپ میں یونہی گزر بسر ہو رہی تھی۔ کہ پھر کسی کے مشورے سے کیمپ کو خیر آباد کہہ دیا اور قسمت آزمائی کے لئے پھرتے پھراتے ڈسکہ کے نواحی گاؤں میترانوالی پہنچے اور وہیں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ یہ ڈسکہ سے بجانب مغرب اپر چناب کی ذیلی نہر نوکھر برانچ کے کنارے آباد ہے۔ یہاں کی فضا بڑی خوشگوار اور زمین بڑی زرخیز ہے۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کے زمانے میں میں اپنے ہم جماعتوں کو سرکنڈے اور نرسل کی قلمیں بنا بنا کر اور معمولی اجرت پر ان کی کتابوں کی جلد بندی کر کے دیا کرتا تھا۔ میں نے پہلے گاؤں کے پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کی اور پھر 1958 میں اسلامیہ ہائی اسکول میترانوالی سے میٹرک کا امتحان اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا۔ میں نے پرائمری، مڈل اور میٹرک میں وظیفہ حاصل کیا۔

ارژنگ: دور حاضر میں اردو ہمارے لئے کس حد تک ضروری ہے؟

ڈاکٹر علی محمد خاں: آج کے ترقی یافتہ دور میں اردو ہمارے لئے از حد ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حلقہ اثر کے اعتبار سے اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو (UNESCO) کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا کی کل چھ ارب آبادی میں سے کم وبیش ایک چوتھائی لوگ اسے بولتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ بڑی زبردست زبان ہے۔ اس میں سائنس کے تمام مضامین کی تعلیم باآسانی دی جا سکتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قیام پاکستان سے دس سال قبل جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں تمام سائنسی مضامین بشمول علم طبقات الارض (GEOLOGY) اور سمندری علوم (OCEANOGRAPHY) اردو میں دی جاتی تھی۔ ڈاکٹر رضی الدین جنہوں نے پاکستان میں یورینیم کی افزودگی کا پودا لگایا تھا۔ وہیں کے گریجوایٹ تھے۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں ضرورت کے تحت اردو کی تدریس کے شعبے قائم ہیں اور وہاں اردو میں پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ تک کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ آج پاکستان بنے ہوئے 65 سال ہونے کو آئے ہیں۔ مگر پاکستان کی قومی زبان ہونے کے باوجود پاکستان میں اردو کو عملاً وہ درجہ حاصل نہیں ہوا جو اسے ملنا چاہئے۔ 1971 میں پاکستان دولخت ہوا تو قومی زبان کی افادیت کو شدت سے محسوس کیا جانے لگا۔ چنانچہ 1971 کے آرٹیکل 251 کے تحت طے پایا کہ 15 سال کے اندر اردو کو قومی زبان قرار دے کر اسے دفتری زبان کے طور پر نافذ کیا جائے گا۔ مگر 39 سال گزرنے کے باوجود اردو کو پاکستان میں دفتری زبان کے طور پر نافذ نہیں کیا گیا جو کہ آئین کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔

ارژنگ: قومی یک جہتی کے لئے قومی زبان کا کردار کتنا اہم ہوتا ہے؟ اردو زبان اس ضمن کیا خدمات سرانجام دے رہی ہے؟

ڈاکٹر علی محمد خاں: اردو ہماری لنگوا فرانکا (LINGUA FRANCA) ہے یعنی پاکستان کے ہر علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان نے غیر مرئی طور پر (NVISIBILY) عوام کو آپس میں منسلک کر رکھا ہے۔ قومی وحدت اور یک جہتی کو مستحکم کرنے میں یہی زبان بنیادی کردار ادا کر رہی ہے۔ آپ پاکستان کے دور دراز علاقوں میں تشریف لے جائیں۔ آپ کو وہاں کے لوگوں سے ابلاغ (COMMUNICATION) میں محض اردو کی وجہ سے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اردو پاکستان میں کوچہ و بازار اور کاروباری زبان ہے۔ البتہ ابھی تک یہ سرکاری زبان نہیں بن سکی۔ اگر ارباب اقتدار فی الواقع ملک کو مضبوط اور مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں انہیں جلد یا بدیر اسے سرکاری اور دفتری زبان بھی بنانا ہوگا۔ ورنہ ملک کی وحدت، اتحاد اور یکجہتی کو خطرات لاحق رہیں گے۔

اردو اخبارات، اردو شاعری، اردو فلمیں، اردو ڈرامے

قومی یک جہتی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔الیکٹرانک میڈیا مختلف چینلز کا ذریعہ ابلاغ اردو ہے۔اردو عوام میں دوریوں کو دور کر رہی ہے اور قربتیں بڑھا رہی ہے۔اساتذہ ،علما،ٹی وی اور ریڈیو کے میزبان اردو کے ذریعے ہی لوگوں کے دلوں اور دماغوں تک رسائی حاصل کر رہے ہیں۔اردو میں لکھے گئے قومی نغمے اور ملی ترانے 1965 اور 1971 کی جنگوں میں ملی وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ بنے ہیں۔میں سمجھتا ہوں ہر حوالے اور ہر زاویے سے اردو ہی قومی یک جہتی پیدا کرنے والا سب سے بڑا عامل ہے۔

ارژنگ: آپ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی نصابی کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں کب سے کام کر رہے ہیں؟ اور کیا آپ شروع سے لے کر اب تک بنائے جانے والے میٹرک اور انٹر لیول کے اردو نصاب سے مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر علی محمد خاں: میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور کی اردو لازمی کی گیارھویں اور بارھویں جماعتوں کی کتاب کے سلسلے میں 1992 سے کام کر رہا ہوں۔1992 سے پہلے انٹرمیڈیٹ کی سطح پر جو کتاب پڑھائی جاتی تھی۔اس کے مولفین میں ایک نام پروفیسر عمر فیضی کا تھا۔فیضی صاحب نے اپنے حصے کا کام میری معاونت سے کیا تھا۔اس زمانے میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں اردو کے ماہر مضمون سید سجاد رضوی تھے جو ہفت زبان ہونے کے ساتھ ساتھ عالم وفاضل شخص تھے اور فیضی صاحب کے پرانے دوست تھے۔جب اردو کا کورس بدلنے لگا تو فیضی صاحب نے نئے کورس کی تیاری کے سلسلے میں بوجہ معذرت کر لی۔اور اپنی جگہ میرے نام کی سفارش کر دی۔اس طرح میں بھی 1993 میں سے پڑھائی جانے والی کتاب کے مولفین میں شامل ہو گیا۔دیگر ناموں میں ڈاکٹر انور محمود، پروفیسر امجد اسلام امجد اور ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا کے نام اہم ہیں۔ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا مذکورہ کتاب کی مدیرہ بھی تھیں۔ورکنگ ٹیچر ہونے کے ناتے اور دوستوں کے اصرار پر اس کتاب کی تمام مشقیں میں نے بنائی تھیں۔اور اسی کتاب کے لئے نصاب کے تقاضوں کے تحت ''ماحولیاتی آلودگی'' کے عنوان سے بڑی محنت سے ایک مضمون بھی لکھا۔یہ کتاب 2003 تک چلی۔اگرچہ اس کتاب پر کچھ اعتراض بھی ہوئے مگر بالعموم اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔2004 میں پھر کورس بدل گیا۔اور موجودہ کورس آ گیا۔میں دم تحریر دسویں جماعت کی اردو لازمی ''بہار اردو'' کا مدیر اور بارھویں جماعت کی اردو لازمی کی ''سرمایہ اردو'' کا مولف ہوں۔علاوہ ازیں دسویں اور بارھویں جماعتوں کی اردو اختیاری کی کتابوں کا مدیر ہوں۔اگر آپ تعلّی پر محمول نہ کریں۔تو عرض کروں کہ ''بہار اردو'' اور ''سرمایہ اردو'' کی مشقیں بنانے کا تقریباً تمام کام میں نے سرانجام دیا تھا۔

اب رہی یہ بات کہ کیا میں شروع سے لے کر اب تک بنائے جانے والے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ لیول کے اردو کے نصاب سے مطمئن ہوں تو میرا جواب اثبات میں ہے۔دراصل ہم جو نصاب تیار کرتے ہیں وہ قومی نصاب کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں تیار کردہ نصاب کے عین مطابق ہوتا ہے۔پہلے کتاب صوبائی سطح کی ریویو کمیٹی دیکھتی ہے اور پھر اسے قومی ریویو کمیٹی وزارت تعلیم اسلام آباد کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔جس میں موثر و معتبر ماہرین مضمون شامل ہوتے ہیں۔کسی بھی مضمون کی کم زور کتاب ان مرحلوں سے باآسانی نہیں گزر سکتی۔میں اپنی تیار کردہ کتاب خوشی خوشی پڑھاتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں قوم کے نونہالوں کے لئے نصاب تیار کرنے والوں میں شامل ہوں۔

ارژنگ: آپ کا ادبی ذوق اتنا اعلیٰ ہے، کبھی شعر کہنے کا خیال نہیں آیا؟

ڈاکٹر علی محمد خاں: ہاں! شعر مجھے اچھے لگتے ہیں۔ایک زمانے میں، میں نے شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔ایک چھوٹی سی بیاض تیار ہوگئی تھی۔پھر میں نے اپنے شعروں کا میر تقی میر، غالب اور مولانا حالی کی شاعری سے تقابل کیا۔مجھے اپنے شعر مولانا حالی کے مقابلے میں، جو کہ میری طرح پانی پت سے تعلق رکھتے تھے،اور دیگر استاد شعراء جن کو میں پسند کرتا تھا، بڑے پھس پھسے لگے۔میں نے خود اپنی شاعری کے دیانتدارانہ تجزیے کے بعد شاعری کو خیرآباد کہہ دیا۔میں سمجھ گیا تھا کہ میرا شعبہ نثر ہے۔

ارژنگ: کتابیں کس قسم کی پڑھنا پسند کرتے ہیں؟

ڈاکٹر علی محمد خاں: مشتاق یوسفی اور انتظار حسین مجھے بہت ہی پسند ہیں۔ناول مجھ سے نہیں پڑھے جاتے۔اور ضخیم ناول بالکل بھی نہیں پڑھ سکتا۔''علی پور کا ایلی'' میں نے بیچ میں ہی چھوڑ دیا تھا۔اور ''راجہ گدھ'' جو کہ بانو قدسیہ کا شاہکار ناول ہے۔اس میں بھی بس ورق گردانی ہی کی ہے۔تنقید اور تاریخ میرے پسندیدہ موضوعات ہیں۔تاریخ میں ایم۔اے کرنے کے علاوہ میری اس میں دلچسپی کا سبب پانی پت سے تعلق بھی ہے۔ہمارے گاؤں کا نام راجہ داہر کے نام پر تھا۔اور پھر وہاں ابراہیم لودھی اور بابر کی یادگاروں کے علاوہ تاریخ کے بہت سے حوالے پانی پت سے نسبت رکھتے ہیں۔

ارژنگ: غیر ادبی مصروفیات کون سی ہیں؟

ڈاکٹر علی محمد خاں: سیر وسیاحت، میں نے پاکستان کا کونا کونا چھان مارا ہے۔اس کے علاوہ تہران گیا، کئی دفعہ سعودی عرب، انگلینڈ، آسٹریلیا، آئرلینڈ ایک ہفتہ رہ کر آیا ہوں پھر سکاٹ لینڈ۔جب بھی موقع ملتا ہے۔ہم دونوں میاں بیوی سیر کے لئے نکل پڑتے ہیں۔اب آسٹریلیا کا پروگرام ہے۔

افسانہ

محبت کا تاج محل

بی بی حلیمہ بشریٰ/کوہاٹ

یاد ہے محسن۔۔۔جب تم میرا ہاتھ اپنے ننھے سے ہاتھ میں پکڑ کر بھاگتے تھے؟؟ جب بچپن میں ہم اکثر اکبر چاچا کے کھیت سے گنے چرا کر بھاگتے تھے۔۔۔وہ بھی کیا سُہانے پل تھے۔۔۔ہے ناں؟؟ انوشہ بچپن کی یادوں میں گم مسکراتے ہوئے بولی۔۔۔

محسن انوشہ کی آنکھوں میں جھانک جھانک کر اُسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی نیلی جھیل سی گہری آنکھوں میں بچپن ڈھونڈ رہا ہو۔۔۔

ایسے کیا دیکھ رہے ہو محسن؟؟ انوشہ نے محسن پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔۔۔

اپنی دُنیا۔۔۔اپنی کُل کائنات۔۔۔اپنی بے پناہ محبت کی حسین وادیاں جو سمٹ کر تمہاری ان خوبصورت پُرکشش آنکھوں میں رچ بس گئیں ہیں۔۔۔محسن نے بڑی محبت سے کہا۔۔۔

میری زندگی، میری ہر خوشی تم ہی سے تو ہے۔۔۔جب اتنی محبت دیتے ہو تو ڈر لگنے لگتا ہے۔۔۔انوشہ بولی۔۔۔

ڈر؟؟ کیسا ڈر؟؟ محسن نے پوچھا۔۔۔

تمہیں کھونے کا ڈر۔۔۔انوشہ نے کہا۔۔۔

ارے پگلی تم بھی کیا کیا سوچتی رہتی ہو۔۔۔ میں بھلا کہاں جاؤں گا؟؟ ہمارے رشتے کی بات بھی تو بچپن سے ہی طے پائی ہے پھر کیوں ڈرتی ہو۔۔۔محسن نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔۔۔

تمہیں یاد ہے جب بچپن میں مسلسل چار دن تک میں نے ایک ہی خواب دیکھا تھا جب تمہیں مجھ سے کوئی چھین کے لے جاتی اور میں دیکھتی رہ جاتی اور پھر ڈر کر جاگ جایا کرتی اور رات بھر روتی رہتی۔۔۔ انوشہ نے بچپن کا جان لیوا خواب یاد دلاتے ہوئے کہا۔۔۔

اچھا اُٹھو۔۔۔دیر ہو رہی ہے۔۔۔کلاسز لینے نہیں جانا؟؟؟ تم تیار ہو جاؤ۔۔۔میں بھی فریش ہو کر آتا ہوں۔۔۔محسن نے بات کا رُخ تبدیل ہوتے ہوئے کہا۔۔۔

او۔کے ڈیئر۔۔۔انوشہ نے چہرے پر جبراً مسکراہٹ کا جال بکھیرتے ہوئے کہا۔۔۔

وہ دونوں یونیورسٹی کے گھنے پیڑوں کے گہرے سایوں تلے ساتھ ساتھ چلتے جا رہے تھے۔۔۔

محسن ہماری رفاقت کے آٹھ برس بیت گئے اور ایسا لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔۔۔وقت بھی کیا ظالم شے ہے کتنی جلدی بیت گیا۔۔۔ا[illegible] نے کہا۔۔۔

محسن کسی سوچ میں غرق راستے میں پڑے ہوئے سوکھے پتوں کو مسلتے ہوئے جا رہا تھا۔۔۔

کیا ہوا۔۔۔تم چپ کیوں ہو؟؟ انوشہ نے ایک نظر سوکھے پتوں پر اور دوسری نظر محسن پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔۔۔

دیکھو ناں یہ سوکھے پتے بھی کبھی ہرے تھے اور آج وقت نے انہیں اس حال پہ پہنچا دیا کہ ہر راہگیر کے پاؤں تلے کچلے جا رہے ہیں۔۔۔محسن نے جواب دیا۔۔۔

اوہو ایک تو تمہارے فلسفے سے تنگ آ گئی ہوں۔۔۔کچھ اور کہو۔۔۔انوشہ نے چھیڑتے ہوئے کہا۔۔۔

کبھی الوداع نہ کہنا۔۔۔کبھی راستہ نہ بدلنا۔۔۔میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔۔۔محسن نے انوشہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ محبت بہت خوبصورت جذبہ ہے۔۔۔دیکھو ناں تم کتنے خوبصورت ہو اور اُس سے کئی زیادہ خوبصورت تمہاری باتیں۔۔۔ارے میں کہاں جاؤں گی۔۔۔میری محبت تو تم سے شروع ہوتی ہے اور تم پہ ختم بھی۔۔۔انوشہ نے محسن کی محبت میں موم کیطرح پگھلتے ہوئے کہا۔۔۔

اوہو میڈم جی تمہارا ڈیپارٹمنٹ آ گیا اب تم جاؤ۔۔۔ہمارے راستے الگ۔۔۔تم اپنے راستے۔۔۔میں اپنے راستے۔۔۔محسن نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔۔۔

آئندہ ایسی بات مذاق میں بھی مت کرنا۔۔۔ انوشہ نے نم ناک آنکھوں سے محسن کو دیکھا۔۔۔

او۔کے۔۔۔او۔کے سوری۔۔۔اب تم جاؤ دیر ہو جائے گی۔۔۔اور ہمیشہ کی طرح تم فرسٹ کلاس مس کر دو گی۔۔۔محسن نے کہا۔۔۔

انوشہ چپ چاپ چل پڑی۔۔۔

اُسی دن شام کے وقت جب محسن لان میں چائے پی رہا تھا اور شام زردی مائل چادر اوڑھے دھوپ کی کرنوں کو اپنے آنچل میں چھپا رہی تھی۔۔۔ہلکی ہلکی موسیقی آن تھی۔۔۔محسن موسیقی سے

لُطف لیتے ہوئے چمن میں چہل قدمی کر رہا تھا۔۔۔کہ انوشہ آئی اور چپ چاپ بینچ پر بیٹھ گئی۔۔۔محسن واپس پلٹا تو اسکی نظر انوشہ پہ پڑی۔۔۔

ارے تم کب آئی ؟؟ محسن نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔۔۔

تمہیں پتا ہے میں اگلے ہفتے اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ ریسرچ کے سلسلے میں ملک سے باہر جا رہی ہوں۔۔۔ انوشہ نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا۔۔۔جس میں کہیں کہیں درد کی ملاوٹ بھی تھی۔۔۔

واہ جی واہ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔۔۔اسی بہانے تم گھوم پھر بھی لوگی اور میری جیب بھی سلامت رہے گی۔۔۔محسن نے شرارتی لہجے میں کہا۔۔۔

تمہیں مزاق کے علاوہ بھی کچھ سوجھتا ہے؟؟ میں پورے تین مہینوں کے لئے جا رہی ہوں۔۔۔انوشہ نے منہ بناتے ہوئے محسن کی طرف دیکھا اور کہا تین مہینے یعنی پورے ۹۰ دن۔۔۔مگر۔۔۔تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔

ارے پگلی تم تو چھوٹی سی بات کو دل پہ لے لیتی ہو۔۔۔میں تو مذاق کر رہا تھا تاکہ تم فریش ہو جاؤ تاکہ اس چاند سے چہرے سے یہ اداسی کے بادل چھٹ جائیں۔۔۔محسن نے قدرے سنجیدہ ہو کر کہا۔۔۔

ہر وقت مزاق اچھا نہیں لگتا محسن۔۔۔انوشہ بولی۔۔۔

دیکھو ناں میری جان اب تم کام کے سلسلے میں جا رہی ہو تو میں نے سوچا کیوں ناں تمہیں ہنسی خوشی وداع کر دوں۔۔۔اب میں بھی اداس ہو جاؤنگا تو تم مزید اپ سیٹ ہو جاتی۔۔۔محسن نے کہا۔۔۔

او۔کے۔۔۔انوشہ نے باریک آواز میں کہا۔۔۔

دیکھو انوشہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔۔۔اس لئے تم خوشی خوشی جاؤ اور خوشی خوشی واپس آؤ۔۔۔پھر نیکسٹ ایئر ہم دونوں ایک ساتھ ہنی مون پہ جائیں گے۔۔۔محسن کی آواز میں درد اور چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ تھی۔۔۔

دیر ہو گئی ہے چلو اندر جاتے ہیں۔۔۔انوشہ کہتے ہوئے اٹھی اور چپ چاپ اندر چلی گئی۔۔۔

رات کی مخمور دوشیزہ سیاہ اور گھنے بال مکمل طور پر کھولے سو رہی تھی کہ انوشہ کی چیخ و پکار سے پورا گھر گونج اُٹھا۔۔۔

انوشہ کی امی، ابو، چچا، چچی اور محسن سب چونک کر جاگ گئے اور اس کے کمرے کی جانب لپکے۔۔۔

کیا ہوا میری گڑیا؟؟ انوشہ کی امی نے اسکو تھامتے ہوئے پوچھا۔۔۔

انوشہ ماہئ بے آب کی مانند تڑپ رہی تھی۔۔۔اور ایک ہی جملہ بار بار کہہ رہی تھی۔۔۔رُک جاؤ محسن۔۔۔رُک جاؤ محسن۔۔۔رُک جاؤ میں آ رہی ہوں۔۔۔

ہوش میں آؤ بیٹا۔۔۔انوشہ کے ابّا نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔۔۔

محسن۔۔۔محسن کہاں ہے؟؟ میرا محسن۔۔۔

امی محسن۔۔۔کہاں ہے۔۔۔انوشہ نے آنکھیں کھولی اور امی کو خوف زدہ نظروں سے دیکھ کر پوچھنے لگی۔۔۔

میں یہاں ہوں۔۔۔تمہارے پاس۔۔۔محسن نے بڑھ کر انوشہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔۔۔

تم اپنی دُلہن کے ساتھ جا رہے تھے۔۔۔میں دور کھڑی تمہیں دیکھ دیکھ کر تڑپ رہی تھی۔۔۔ہمارے بیچ دلدل تھی میں اس دلدل کو پار کر کے تمہارے پاس آنا چاہتی تھی مگر اس میں قدم رکھتے ہی میں اسمیں دھنستی چلی گئی۔۔۔جبکہ دلدل کے اُس پار تم اپنی دلہن کا ہاتھ تھامے جا رہے تھے۔۔۔میں نے تمہیں روکنے کے لئے کئی بار آواز لگائی مگر تم نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔۔۔انوشہ نے سسکیاں بھرتے ہوئے ایک ہی سانس میں محسن کو اپنا خواب سنایا۔۔۔

ارے پاگل یہ بھی کوئی بات ہے بھلا؟؟ یہ سب تمہارا وہم ہے۔۔۔میں تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤنگا؟؟ چلو اب سو جاؤ۔۔۔صبح تمہیں جانا بھی ہے ناں۔۔۔محسن نے انوشہ کا تکیہ سیدھا کرتے ہوئے کہا۔۔۔

سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے مگر انوشہ کی امی اس کے ساتھ سو گئی۔۔۔

یہ لڑکی تو پاگل ہے۔۔۔میں نے تو پہلے ہی آپ سے کہہ دیا تھا کہ محسن کی شادی میری بھانجی صائمہ سے کروا دیتے ہیں۔۔۔اچھی خاصی خوبصورت اور سلجھی ہوئی بچی ہے۔۔۔محسن کی امی نے محسن کے ابو سے کہا۔۔۔

پاگل ہو گئی ہو کیا؟؟ محسن اور انوشہ کا رشتہ بچپن میں ہی طے ہو چکا تھا۔۔۔یہ بات تم بھی جانتی ہو، میں بھی اور محسن بھی۔۔۔اب فضول کی باتیں مت سوچو اور چپ چاپ سو جاؤ۔۔۔محسن کے ابو نے عینک اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔۔۔

ہاں ہاں سوتی ہوں۔۔۔آپ کو تو اپنی بھتیجی ہی پیاری ہوگی ناں۔۔۔محسن کی امی بڑبڑائی۔۔۔

اگلے روز صبح جب سورج کا حنائی رنگ پوری

کائنات پر قابض ہوا۔۔۔اور انوشہ کے جانے کا وقت آ گیا تو محسن اس کا بیگ لئے اُسے ایئر پورٹ چھوڑنے گیا۔۔۔

راستے میں دونوں خاموش رہے۔۔۔ کہتے ہیں ناں کہ جب رشتہ پرانا ہوجائے تو خاموشی بھی بہت کچھ کہہ دیتی ہے۔۔۔اور اس دن اُن دونوں کی خاموشی نے بھی ایکدوسرے سے بہت کچھ کہا۔۔۔

ایئر پورٹ پہنچے تو محسن نے دھیمی آواز میں کہا۔۔۔انوشہ اپنا خیال رکھنا۔۔۔الفاظ اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کرادا ہورہے تھے جیسے وہ خود پر جبر کر کے بول رہا ہو۔۔۔

اتنے میں اناؤنسمنٹ ہوگئی۔۔۔

تمہاری فلائیٹ کا ٹائم ہوگیا ہے میری جان۔۔۔خوشی خوشی جاؤ اور خوشی خوشی واپس آنا۔۔۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔۔۔محسن نے انوشہ کو بیگ دیتے ہوئے کہا۔۔۔

اپنا خیال رکھنا۔۔۔انوشہ کی آنکھیں بھر آئیں مگر خود پر قابو پا کر چل پڑی۔۔۔کچھ دور جا کر انوشہ نے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ ہلا کر محسن کو خدا حافظ کہا۔۔۔

محسن نے بھی مسکرا کر جواباً ہاتھ ہلایا۔۔۔

انوشہ کو رخصت کر چکنے کے بعد جب محسن گھر واپس آیا۔۔۔تو گھر بہت سُونا سُونا لگ رہا تھا۔۔۔ سب کچھ تھا بس انوشہ کی کمی تھی اور گھر ویرانے کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔۔۔انوشہ کی یادیں محسن پر ایک زہریلے ناگ کی طرح حملہ آور ہو رہی تھیں اور محسن ان سے بچنے کے لئے لان کے ایک کونے میں چھپ کر بیٹھا تھا۔۔۔

ایک ہفتہ جیسے تیسے گزر گیا۔۔۔محسن پورا دن انوشہ کے کمرے میں بیٹھ کر حسرت بھری نگاہوں سے اس کی استعمال کی ایک ایک شے کو دیکھتا اور رات کو اس کی یادوں کا غلاف اوڑھ کر ستاروں کو سُلاتا۔۔۔

ایک شام وہ لان کے کونے میں اُسی بینچ پر بیٹھا تھا جہاں روز وہ انوشہ کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتا تھا کہ اچانک ابو کی تیز آواز نے محسن کو چونکا دیا۔۔۔اس نے پلٹ کر دیکھا تو گھر والے محسن کی امی کو بازوؤں میں تھامے گاڑی کی جانب لے کر آرہے تھے۔۔۔

محسن بھاگ کر ان کے پاس آیا۔۔۔کیا ہوا ابو؟؟امی کو کیا ہوگیا ہے۔۔۔

تمہاری امی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے جلدی سے ہسپتال چلو۔۔۔محسن کے ابو نے کہا۔۔۔

وہ سب ہسپتال پہنچے تو امی کو جلدی سے ایمرجنسی وارڈ لے گئے۔۔۔رات بھر اُن کی حالت خراب رہی اور گھر والے دعا کا سہارا لئے رات بھر وارڈ کے سامنے بیٹھے رہے۔۔۔

صبح تقریباً نو بجے کے قریب ڈاکٹر نے اُنہیں وارڈ میں شفٹ کر دیا۔۔۔اور رشتہ داروں کو ملنے کی اجازت دی۔۔۔

محسن اور اس کے ابو کو آفس میں بُلا کر ڈاکٹر نے چتاونی دی کہ مریض کو کسی بھی قسم کے ذہنی دباؤ سے دور رکھا جائے کیونکہ ان کی حالت خراب ہے اور کوئی بھی ٹینشن ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے۔۔۔

ڈاکٹر صاحب ہم اُنہیں گھر کب لے جاسکتے ہیں؟؟محسن نے پوچھا۔۔۔

ان کی حالت اب بہتر ہے۔۔۔آپ لوگ چاہے تو ابھی لے جاسکتے ہیں بس خاص خیال رہے کہ اُنہیں ہر قسم کی پریشانی سے دور رکھے۔۔۔

ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے وہ لوگ امی کو گھر لے آئے۔۔۔

اب میری پیاری امی کیسی ہیں؟؟محسن نے امی کو بستر پر لٹاتے ہوئے کہا۔۔۔

قدرے بہتر ہوں بیٹا۔۔۔اس کی امی کی آواز میں تھکاوٹ گُندھی ہوئی تھی۔۔۔

امی آپ سو جائیں۔۔۔آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔۔۔محسن نے کہا۔۔۔

بیٹا اب تو ہمیشہ کی نیند سونے کی عمر ہوگئی ہے۔۔۔امی نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔۔۔

ارے امی ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔۔۔آپ تو ہزاروں سال جئیں گی۔۔۔اللہ کرے میری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔۔۔محسن ماں کے پیار میں جذباتی ہو کر بولا۔۔۔

بیٹا عمر کے آخری مراحل میں تمہاری خوشیاں دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔امی نے خواہش ظاہر کی۔۔۔

مگر امی میں تو خوش ہوں۔۔۔

بیٹا میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے جیتے جی تمہاری دُلہن اس گھر میں لانا چاہتی ہوں۔۔۔

امی جان اتنی سی بات۔۔۔انوشہ واپس آجائے تو آپ کی اس خواہش کی تکمیل بھی ہوجائے گی۔۔۔

مگر میں تمہاری شادی تمہاری خالہ زاد صائمہ سے کرانے کی خواہاں ہوں۔۔۔

امی کے یہ الفاظ سنتے ہی محسن ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا جیسے اسے بجلی کا زوردار جھٹکا لگا ہو۔۔۔

امی آپ ہوش میں تو ہیں؟؟ میرا رشتہ آپ لوگوں نے خود ہی انوشہ سے طے کیا تھا تو اب اچانک یہ صائمہ بیچ میں کہاں سے آئی؟؟محسن تو یہ بات سن کر

جیسے پاگل ہو رہا تھا۔۔۔

ہاں ہاں ہم نے ہی انوشہ سے تمہارے رشتے کی بات پکی کی تھی مگر اُس وقت ہمیں کیا معلوم تھا کہ انوشہ کو پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔۔۔اُس کی امی بے معنی دلائل دینے لگی۔۔۔

امی انوشہ پاگل نہیں ہے۔۔۔اور میں اُس کے علاوہ کسی سے شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔محسن کی آواز میں گستاخی کا عنصر شامل ہو گیا۔۔۔

مت مانو میری بات۔۔۔اپنے باپ کی طرح اپنی من مانی کرتے رہو۔۔۔میری تو اس گھر میں کوئی حیثیت ہی نہیں۔۔۔جسے دیکھو اس انوشہ کی وکالت کرنے پہ تُلا ہوا ہے۔۔۔اب تو میرا اپنے ہی بیٹے پر حق نہیں رہا۔۔۔ ہائے ہائے پھوٹی قسمت میری۔۔۔محسن کی امی نے واویلا مچا دیا۔۔۔

اس کا شور و غوغا سن کر سب لوگ کمرے میں دوڑے چلے آئے۔۔۔

کیا ہوا؟؟ یہ شور کیسا ہے؟؟ محسن کے ابو نے پوچھا۔۔۔

ابو میں آپ لوگوں کو ایک بات صاف صاف بتا دوں میں انوشہ کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔۔۔میں انوشہ کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی۔۔۔

ابو نے منہ پہ اُنگلی رکھ کر محسن کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور محسن بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گیا۔۔۔

محسن کے ابو بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔۔۔اور اُس کی امی کو سمجھانے لگے کہ محسن اور انوشہ کی بات طے ہو چکی ہے لہذا اس بات کو یہیں ختم کر دیں تو بہتر ہو گا۔۔۔مگر محسن کی امی تھی کہ کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔۔۔اور کسی کی ایک بات پہ اُودھم مچا دیتی اور ان کی طبیعت بگڑنے لگتی۔۔۔

بالآخر محسن کے ابو مجبوراً اپنے بیٹے کو سمجھانے لگے کہ وہ اپنی امی کی بات مان لے۔۔۔

بیٹا کیا تمہیں اپنی خواہشات اپنی ماں کی زندگی سے زیادہ عزیز ہیں۔۔۔خدارا بات مان لو میرے بچے۔۔۔اپنے بوڑھے باپ کی لاج رکھ لو۔۔۔میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔۔۔محسن کے ابو کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ رہے تھے۔۔۔

نہیں نہیں ابا ہاتھ جوڑ کر مجھے گناہ گار نہ کریں۔۔۔آپ لوگ جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہو گا۔۔۔محسن نے ابو کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا اور اُٹھ کر انوشہ کے کمرے سے ہوتے ہوئے منہ پھیر کر اس انداز میں اپنے کمرے کی جانب چلا گیا جیسے وہ اُس کی چیزوں کا بھی سامنا نہ کر سکتا ہو۔۔۔محسن قابلِ رحم کیفیت تک پہنچ گیا تھا ایک طرف اُس کے بوڑھے باپ کی بے بس ولاچار صورت تھی جس کی معصوم نگاہیں اپنے بیٹے سے اس کی ماں کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھیں جبکہ دوسری جانب اُس کی آنکھوں میں بسی اُس کی کُل کائنات اُس کا عشق انوشہ تھی۔۔۔ان دونوں کے بیچ وہ بڑی طرح پھنس چکا تھا اور بالآخر خود پہ جبر کر کے اس نے اپنے عشق کو بالائے طاق رکھ کر اپنے والدین کا حق ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔۔۔

محسن کی ہاں سن کر انوشہ کے والدین کو فکر لاحق ہوئی جبکہ محسن کی امی تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔۔۔

اگلے روز وہ اپنی بہن کے گھر جا کر صائمہ سے محسن کی بات پکی کر کے آئی۔۔۔

گھر میں شادی کی تیاریاں زور وشور سے شروع ہوئیں۔۔۔محسن کی امی چاہتی تھی کہ یہ شادی انوشہ کے آنے سے قبل ہو جائے اس لئے اگلے ہی ہفتے شادی کی تاریخ طے پا گئی کیونکہ اگلے ہفتے انوشہ نے واپس آنا تھا۔۔۔

ہوتے ہوتے شادی کا دن آ پہنچا۔۔۔اور محسن دُلہن لینے خالہ کے گھر بوجھل قدموں سے زندہ لاش کی طرح جا رہا تھا جیسے کسی نے اُس کے جسم میں ہاتھ ڈال کر اُس کی روح کھینچ کر نکال لی ہو۔۔۔وہ چُپ چاپ چل رہا تھا پچھلے ایک ہفتے سے اس کے مُنہ سے ایک شبد نہیں نکلا تھا۔۔۔

ہجر کی پہلی سالگرہ ہے
وصل کی پہلی برسی ہے

اس شعر کے مصداق محسن اپنے پیار کی تمام یادیں طاقِ نسیاں کے حوالے کر کے امی کی خواہش پوری کرنے خالہ کے گھر پہنچا اور تمام رسم و رواج سادگی سے نبھا کر دُلہن کو گھر لے آئے۔۔۔جونہی وہ لوگ گھر پہنچے عین اُسی وقت انوشہ بھی گھر کے سامنے گاڑی سے اُتری۔۔۔انوشہ کے سامنے لال رنگ کی گاڑی کھڑی تھی جس کے ایک دروازے سے محسن نگاہیں زمین بوس کئے جبکہ دوسرے دروازے سے اُس کی نویلی دُلہن نمودار ہوئی۔۔۔

یہ منظر دیکھ کر انوشہ کے ہاتھ سے وہ تاج محل گر گیا جو وہ اپنے محسن کے لئے بطور تحفہ لائی تھی۔۔۔اُس کے سپنوں کا تاج محل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا۔۔۔اُس کا اعتبار ریزہ ریزہ ہو گیا۔۔۔اور اُس کے دیکھے ہوئے اُس ڈراؤنے خواب کی تعبیر آج اُس کی نظروں کے سامنے سج دھج کے کھڑی تھی۔۔۔

مجھ کو یہاں پر اور تو کوئی کام نہیں
میں دنیا میں تم سے ملنے آیا ہوں
حسن عباسی

افسانہ

کسک

فرزانہ سلیم

محبت سرسری قصہ نہیں ہے
ذرا تفصیل میں جانا پڑے گا

سہ پہر کے ڈھلتے سائے موبائل کی بیل بجی...... میری سماعتوں سے جو آواز ٹکرائی اُس میں سرد مہری تھی۔ میڈم جی! ہم کل آئیں گے۔ آسمان پہ کالے کالے بادلوں کے تیرتے ٹکڑے اور کوہاٹ کی شوخ ہواؤں کے بدصورت اور منچلے جھونکوں کے درمیان رات کی دوشیزہ نے اپنی گھنی سیاہ زلفوں میں میرے ''وجود'' کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ کالج کے صحن میں لگی سرخ لائٹس میں بیٹھی میں لفظوں کا تانا بانا بننے بیٹھ گئی۔

ایک میں ہوں کہ نامکمل ہوں
چاند پورا ہے، رات پوری ہے

''محبت بہت خوبصورت احساس'' نجانے کیوں یہ سب سوچنے کو من کر رہا تھا۔ مگر تھکاوٹ کے باعث کمرے میں پہنچتے ہی نیند کا غلبہ ہوا اور سوگئی۔

تادم صبح نیند کا خمار گیا اور میں دوڑی جلدی جلدی آفس کے لیے تیار ہوئی۔ ناشتہ میں نہیں کرتی مگر چائے کا ایک کپ آفس میں لیا اور اپنے مہمانوں کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔

میرے مہمان آئے۔ میں ان سے محوِ گفتگو تھی کہ ایک دم سے میری سماعتوں سے اجنبی آواز ٹکرائی۔ ایک ایسا چہرہ جو پہلے نہیں دیکھا۔ چہرے پر تروتازگی رقص کناں تھی۔ خوبصورت پیشانی، آنکھوں میں ذہانت کی بھرپور چمک لہجے میں تمکنت گفتگو میں ٹھہراؤ، یہ کون؟......

لفظی تعارف ہوا اور پھر ہم اپنے آفس کے امور میں مصروفِ عمل ہو گئے۔ اُس نے فریحہ سے کہا چائے نہیں پلاؤ گی؟ فریحہ نے اُس کو پیش کی۔

اُس کے دل کے کسی کونے میں یہ گمان نہ تھا کہ یہ چمکتی ہوئی آنکھیں اُس کی شخصیت کا تعاقب کر رہی ہیں۔

نجانے کیوں فریحہ نے اُس دن وجی کے لنچ کا انتظام خود کیا!

وجی اچانک سے فریحہ کی آنکھوں میں جھانکتا وہ سہم جاتی۔ ایک انجانے سے خوف سے......

یہ پل کیسے بیت گئے۔ ایک مرتبہ پھر وقت نے پر لگائے اور محوِ پرواز ہو گیا۔ وجی نے وقتِ رُخصت فریحہ کی طرف ہاتھ ہلا کر ''خدا حافظ'' کہا۔ فریحہ نے لرزتے ہاتھوں سے اُس کو رُخصت کیا......

فریحہ خود سے گویا ہوئی:

محبت ہو ہی جاتی ہے
کسی نامعلوم بستی سے
کسی کاغذ کی کشتی سے
کسی دھندلی سی حیرت سے
یا پھر!
کسی جھوٹی تسلی سے
محبت ہو ہی جاتی ہے

یہ اشعار فریحہ کے لبوں پر گنگنانے لگے۔

شام کے رنگین آنچل نے مجھے آج کیوں اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔ آج وہ خود سے سینکڑوں سوال کیے جا رہی تھی۔

موبائل پہ میسج آیا...... میں نے دیکھا...... وہی تھا! نجانے کیوں دل دھڑکا اور پھر ایک دو میسج کے بعد فریحہ ٹھٹک گئی۔ میں کیوں خاموش ہو گئی ہوں۔ یونہی زندگی رواں دواں وجی کے موبائل پر Messages آتے رہے اور وہ جواب دیتی رہی۔ مگر فریحہ کے دل میں اُس کی عزت و وقار کے علاوہ کوئی جذبہ موجود نہ تھا۔ ایک مرتبہ پھر فون کی گھنٹی بجی۔

ریسیور کان سے لگایا...... آفس سے کال تھی کہ کل آپ نے ہمارے ساتھ Official Visit پہ جانا ہے۔ ایک مرتبہ پھر اُس کو خاموشی نے آ گھیرا۔ رضیہ اندر آئی۔ اُس نے کہا رضیہ دروازہ بند کر دو اور وہ لامحدود سوچوں میں مستغرق ہو گئی۔

خوشی انجانی خوشی...... اور خوف کے ملے جلے جذبات اُس کے دل میں مچلنے لگے۔ اگلے روز صبح جب سورج کا نارنجی رنگ پوری کائنات پر قابض ہوا تو فریحہ کے پاس وجی کا Message آیا ہم اسٹاپ پر ہوں گے تم آ جانا میں تمہیں Pick کروں گا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ کیونکہ ایک روز قبل اُس نے ہی بہانہ بنایا کہ مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔ مگر اب...... وہ گاڑی میں بیٹھی وجی کی چبھتی ہوئی نظروں کو محسوس کر رہی تھی۔ مگر وہ خاموش اپنے ہونٹوں پر پُرتجسس و مصنوعی مسکراہٹ سجائے گاڑی میں موجود لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔

راستے میں ہوٹل آیا۔ سب کھانا کھانے کے لیے اُترے۔ فریحہ نہ چاہتے ہوئے بھی کھانے کے لیے ان کے ساتھ شریک ہوگئی۔ وجی کی طرف اُس کی نگاہیں اٹھنے کی جرات نہ کر سکیں۔ نجانے اُسے کیوں لگتا تھا کہ اگر اُس نے وجی کی طرف دیکھا تو اُس سے کوئی ناکردہ گناہ سرزد ہو جائے گا اس لیے خاموشی سے نظریں جھکائے پلیٹ پہ بے دلی سے کھانا کھانے لگی۔ فریحہ نے وجی کو ٹشو دیا......

اُس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ ایک مرتبہ پھر گاڑی اپنی منزل کی جانب فراٹے بھرنے لگی۔

راستے میں دونوں خاموش:

آؤ چپ کی زبان میں خاور
اتنی باتیں کریں کہ تھک جائیں

اس روز ان دونوں کی خاموشی نے ایک دوسرے سے بہت کچھ کہا۔ فریحہ نے وجی کی سیٹ پر نہ چاہتے ہوئے بھی ہاتھ رکھا۔ انجانا خوف وجی کو کچھ ہو جائے گا...... اچانک ڈرائیور نے Over take لیا اور اس کے منہ سے چیخ نکلنے سے رہ گئی کہ اُس نے اس زور سے وجی کو چھوا جیسے وہ اُس کو اپنی بانہوں میں محفوظ کرے گی۔ مگر ایک دم سے خوفزدہ ہو کر وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کیا خطا سرزد ہو گئی۔ یونہی سفر گزرتا گیا۔ شام کے سرمئی آنچل نے ان دونوں کو اپنی منزل پہ پہنچا دیا۔ وجی نے رات ہوٹل میں گزاری اور فریحہ اپنے والد کے گھر چلی گئی۔

وہ رات نجانے کیوں فریحہ کی بے چین گزری۔ اُس کے دل میں تلاطم خیز موجوں کا ایک طوفان برپا تھا۔ وہ اپنے آپ سے محو گفتگو ہے۔ وہ کیا سوچتے جا رہی ہے۔ اُس کے دل سے ایک ہوک اُٹھی "نہیں" مجھے ان راستوں سے خوف آتا ہے۔ مجھے جدائی کے کرب سے نہیں گزرنا مجھے سلگتے دن اور تڑپتی راتیں نہیں بتانی؟ یہ سب کہہ کر اپنے نادان دل کو وہ خاموشی کا زہر پلا کر خود خواب خرگوش کے مزے لوٹنے چلی گئی۔ اچانک اُس کی آنکھ کھلتی ہے تو اس کی زندگی کی ایک نئی روشن صبح کی کرنیں اُس کی آنکھوں کو چندھیاتی ہیں۔ وہ دوڑی آفس کے لیے جلدی سے تیار ہوئی۔ وہ وجی کے غصے سے واقفیت رکھتی تھی۔ شاید یہی غصہ اُس کی شخصیت کو فریحہ کی طرف مائل کر رہا تھا۔ پریشانی کے عالم میں وہ گاڑی میں بیٹھی اور وجی کے پاس ہوٹل پہنچ گئی۔ براؤن شلوار قمیص میں ملبوس چمکتی آنکھیں نجانے کیوں ناشتے کی ٹیبل پہ اُس کو لگا کہ وہ فریحہ کا انتظار کر رہا ہے؟؟؟

وجی نے فریحہ کو کہا "آئیں ناشتہ کرتے ہیں" نجانے کیوں فریحہ کی مردوں سے فاصلے کی از حد کھینچی ہوئی لکیر نے اُس سے انکار کروا دیا۔ وہ بولی "نہیں میں نے نہیں کرنا ناشتہ"

تمام لوگ Sitting room میں آ گئے۔ آفس کے کچھ اہم معاملات زیر بحث آئے۔ وجی کو نجانے فریحہ کی کسی بات پر غصہ آیا اس نے فریحہ کو ڈانٹا اور گاڑی کی طرف چل دیا۔

فریحہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی تیرنے لگے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نفرت کے جذبات دل میں لے کر بوجھل قدموں سے اُس کے پیچھے چلنے لگی۔

نہ چاہتے ہوئے وہ وجی کے عقب میں ایسی ڈبک کر بیٹھ گئی کہ اب زندگی بھر اُس کو آنکھ اُٹھا کر دیکھنا کفر کے مترادف ہوگا۔ نفرت و بے چینی کے ملے جلے جذبات نے اُس کو سوچوں میں مستغرق کر دیا۔ اوہ میرا تو ہینڈ بیگ نہیں ہے۔ فریحہ بولی

وجی نے چونک کر اُس کو دیکھا۔ نہ چاہتے ہوئے وہ اس سے مخاطب ہوئی اور بولی کہ اس میں میرا قیمتی سامان ہے۔

وجی نے اُس کو اپنا Cell phone دیا کہ تم خود رنگ کرو۔ وجی نے ہوٹل میں کال کی اور فریحہ کا بیگ مل گیا...... دونوں آفس پہنچے فریحہ وجی کے بائیں طرف بیٹھ گئیں۔ وہ اُس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چائے آ گئی...... وجی نے اُس کو بلایا۔ وہ اپنے لبوں پہ مصنوعی مسکراہٹ سجا کر اُس کے پہلو میں آ کر صوفے پہ براجمان ہو گئی۔ وہ اپنا کام کرتا رہا۔ کبھی فریحہ کو محسوس ہوتا کہ وہ اس کو چونک کر دیکھتا ہے۔ مگر کیوں فریحہ کے دل میں اُس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ کھانے کا وقفہ ہوا...... لنچ روم تک جاتے وہ کچھ نہ بولی۔ وجی نے اُس کو اپنے ساتھ بٹھایا مگر وہ رُخ موڑ کر بیٹھی۔

وہ خاموشی سے بے دلی کے ساتھ نوالے توڑ رہی تھی۔ روانگی کا وقت آیا۔ وہ وجی کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ مگر وجی بضد تھا کہ تم جاؤ گی۔ وہ اُس کے لیے رُک گیا۔ وہ نہ جانے کیوں نہ چاہتے ہوئے وجی کی تمام باتوں کو سر جھکائے تسلیم کرتی جا رہی تھی۔

وہ خاموشی سے گاڑی میں پیچھے بیٹھ گئی۔ تمام راستہ دونوں خاموش رہے۔ وجی بہت تھک گیا تھا۔ وہ میٹھی نیند کی وادیوں میں پہنچا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ فریحہ کیوں اُس کو دیکھ رہی ہو؟ اس کے دل سے آواز آئی۔ اس کو نفرت ہو رہی تھی۔ پھر بھی اُس کا من چاہا کہ وجی آرام صحیح نہیں کر پا رہا۔ وہ اس کے سر کے نیچے Pillow سرکا دینا چاہتی تھی تاکہ وہ سکون سے سو جائے۔ فریحہ خوفزدہ ہوئی یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ کچھ لمحوں بعد وجی بیدار ہوا مگر خاموش تھا۔ اُس نے موسیقی لگا دی۔

فریحہ تھکن سے چور تھی۔ اچانک گہری نیند کا پلو اوڑھ کر وہ سو گئی۔ ایک دم سے اُسے محسوس ہوا جیسے اُسے کچھ چبھن ہوئی ہو۔ وہ سخت سہم گئی۔

اُس کے گلے میں آواز رُک سی گئی۔ انجانے سے خوف نے اُس کو گھیرا۔ وجی نے اُسے اپنے گھر چھوڑا۔ وہ بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ عجیب کشمکش میں مبتلا اُس کے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں۔ کروٹیں بدل رہی تھی ایک مرتبہ بھی اس کا Cell phnone بجا۔

وجی؟؟ ہیلو...... فریحہ نے فوراً اُس کو Sorry بولا کہ سر آپ کا Message لیٹ پڑھا۔ وہ نجانے کیوں وضاحتیں دینے لگی کہ مجھے گاڑی میں نیند کیوں آ گئی تھی۔ وجی بولا! میں نے تمہارا ہاتھ تھامے رکھا تھا جب تم میرے پاس سو رہی تھی۔

"مجھے تم سے محبت ہے وجی بولا"...... "فریحہ مجھے آپ سے محبت ہے۔"

تمام رات دونوں محبت کے حسین جذبات و احساسات لے کر باتیں کرتے رہے۔ کبھی وجی کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتی تو کبھی اُس کی تعاقب کرتی آنکھیں فریحہ کے دل میں گھر کرنے لگیں۔

اذان کی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی اور فریحہ بولی...... یہ حسین خواب مجھ سے کہاں کھو گیا۔

رستم نامی/پشاور

ہم لوگ بھی رہتے ہیں بہت بے سروساماں
ہم لوگ بھی کرتے ہیں توکل پہ گزارہ

کرتے ہیں فقط صبر و تحمل پہ گزارہ
یعنی ہے تمنا و تخیل پہ گزارہ

اُس پار وہ مجبور ہے بے چین اِدھر ہم
دونوں کا ہے ٹوٹے ہوئے اک پُل پہ گزارہ

ملتا ہی نہیں ہے جو کوئی کام تو پھر ہم
کرتے ہیں مشاغل کے تعطل پہ گزارہ

یہ شہر گزرگاہِ گزارہ ہے سو ہم لوگ
کرتے ہیں ترے طرزِ تغافل پہ گزارہ

اس کوچۂ بے ربط میں ہم غمزدگاں کا
آدھے پہ گزارہ ہے کبھی کل پہ گزارہ

اس بار خدا جانے وہ کس اور کھلا ہے
لے دے کے ہمارا تھا اُسی گُل پہ گزارہ

ہم لوگ بھی رہتے ہیں بہت بے سروساماں
ہم لوگ بھی کرتے ہیں توکل پہ گزارہ

یہ شعر و سخن ہی مری خوراک ہے نامی
کرتا ہوں تمنا و تخیل پہ گزارہ

چھوڑ دیا پھر ہجرت سے دوچار وغیرہ کرواکر
اُس نے ہم کو جنت کا دیدار وغیرہ کرواکر

مجھ سے میرے سارے راز اگلوائے ہشیاری سے
باتوں باتوں میں اُس نے اظہار وغیرہ کرواکر

مُجرم کو بھی استثنا کی چھوٹ وغیرہ دی ہم نے
چھوڑ دیا دشمن کو ہم نے پیار وغیرہ کرواکر

اب کہتے ہو عشق، محبت، پیار وغیرہ ٹھیک نہیں
پہلے ہم سے اچھا خاصا پیار وغیرہ کرواکر

شام و سحر پھر دلجوئی بھی کرتے رہتے ہیں میری
یار مرے دشمن سے مجھ پر وار وغیرہ کرواکر

وقت مجھے باہر کردے گا منظرنامے سے اک دن
مجھ سے اپنی مرضی کا کردار وغیرہ کرواکر

پھرتے ہو تم آج بہت آگے پیچھے جس کے نامی
چھوڑے گا وہ شخص تمھیں بے کار وغیرہ کرواکر

بسر کر رہا ہوں سہارے بغیر
میں زندہ ہوں دیکھو تمھارے بغیر

نہیں چل سکے گا ہمارا نظام
کبھی دوسروں کے اشارے بغیر

خفا ہو کے بھی رہ سکیں گے کہاں
ہم اک دوسرے کو پکارے بغیر

یہ کارِ محبت ہے اس میں کبھی
منافع نہ ہوگا خسارے بغیر

میں پڑھتا نہیں ہوں جریدہ کوئی
محبت کے تازہ شمارے بغیر

غموں کا مداوا نہیں ہے کوئی
دل و جاں تمھارے پہ وارے بغیر

مجھے چین آتا نہیں میرے دل!
تجھے مشکلوں سے گزارے بغیر

نہ بیٹھیں گے آرام سے ہم کبھی
تجھے آسماں سے اُتارے بغیر

جہاں میں کوئی کام والا نہیں
ہمارے علاوہ، تمھارے بغیر

کہیں کی ہوا راس آتی نہیں
مجھے یار نامی ہزارے بغیر

مری بات آئی گئی ہو گئی
ملاقات آئی گئی ہو گئی

وہ رونا بھی آیا گیا ہو گیا
وہ برسات آئی گئی ہو گئی

گزاری گئی تیرے پہلو میں جو
وہ اِک رات آئی گئی ہو گئی

گیا تجھ پہ احسان تھا جو مرا
مدارات آئی گئی ہو گئی

مجھے وقت نے خود سے منہا کیا
مری ذات آئی گئی ہو گئی

کیا کام جب انتہا سے شروع
شروعات آئی گئی ہو گئی

ملی تھی ذرا سی جو عمر رواں
مرے ہاتھ آئی، گئی ہو گئی

یواے ای میں چند روز

رودادِ سفر و احوالِ تقاریب

حسن عباسی

متحدہ عرب امارات جہاں سے ہمیشہ اچھی خبر ہی آتی ہے اس بار اچھی خبر یہ آئی کہ ایکسپو 2020ء کے انعقاد کا اعزاز دبئی کو حاصل ہوا۔ قومی دن کے موقع پر حکمران شیخ محمد کے فرزند شیخ ہمدان نے دُنیا کی بلند ترین عمارت پر اپنے ہاتھوں سے یواے ای کا پرچم لہرایا۔ شجاعت اور بہادری کی اس مثال سے پتہ چلتا ہے کہ متحدہ عرب امارات کے حکمرانوں کے نزدیک مستقبل میں اپنے ملک کی مثالی ترقی کتنی اہم ہے۔

ایوانِ اقبال (یواے ای) کے صدر پرنس اقبال گورایا جو کہ ادبی تقریب کے انعقاد کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اس بار بھی انھوں نے جذبۂ خیر سگالی کے طور پر دبئی میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا جس میں یواے ای کے شعراء کے علاوہ سویڈن سے عابدہ سیال کویت سے فیاض وردگ، پاکستان سے منظر ایوبی، پروین حیدر اور راقم نے شرکت کی۔ پرنس اقبال نے ہمیشہ کی طرح نہایت گرم جوشی سے خالص لاہوریئے انداز میں شعراء کا بھرپور استقبال کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک نہایت ملنسار اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ بلکہ نہایت ادب پرور، سیاسی و سماجی شخصیت اور اعلیٰ منتظم بھی ہیں۔ یواے ای کے بہت سی یادگار ادبی تقاریب اُن کی کاوشوں کی مرہونِ منت

ہیں اور اس وقت بلاشبہ سلیم جعفری کے بعد انھوں نے ہی وہاں فروغ ادب کی شمع روشن کر رکھی ہے۔ متحدہ عرب امارات میں مجھے مشاعروں میں شرکت کے لیے اکثر مدعو کیا جاتا ہے۔ یو اے ای کی سیاحت اور ان مشاعروں کے احوال سے متعلق حال ہی میں میرا سفرنامہ ''ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا'' شائع ہوا ہے۔ یہ سفرنامہ جب میں نے پرنس اقبال کو پیش کیا تو انھوں نے اس کی تقریب پذیرائی کو بھی مشاعرے سے منسلک کر دیا۔ پرنس اقبال صرف مشاعرہ ہی نہیں کراتے بلکہ مشاعرے کی خوبصورتی اور کامیابی کے لیے بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ نیز شعراء کے لیے ضیافتوں اور سیر و سیاحت کا بھی خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔

اس بار تقریب پذیرائی و محفل مشاعرہ دبئی کے دسترخوان ریسٹوران میں منعقد ہوئی۔ ہال کو یو اے ای اور پاکستان کے پرچموں سے سجایا گیا تھا۔ شعرائے کرام اور منتظمین کے کندھوں پر بھی مفلر نما فلیگز تھے۔ تقریب کے پہلے حصہ میں راقم کے سفرنامے ''ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا'' اور منظر ایوبی کے شعری مجموعے ''فردوس جنوں'' کی تقریب پذیرائی ہوئی۔ صدارت معروف ادیب ع س مسلم نے کی۔ مہمان خصوصی یو اے ای میں مسلم لیگ (ن) کے صدر نورالحسن تھے۔

نظامت کے فرائض معروف ناول نگار اور شاعر ڈاکٹر ظہیر بدر نے سرانجام دیے۔ تقریب میں سفرنامے اور فردوس جنوں سے متعلق ناقدین اور مقررین نے سیر حاصل گفتگو کی۔ اس کے بعد محفل مشاعرہ میں متحدہ عرب امارات کے شعراء فرہاد جبریل، امجد اقبال امجد، ڈاکٹر اکرم شہزاد، مقصود تبسم، حفیظ عامر، ڈاکٹر زبیر فاروق، ظہیر بدر، علی سرفراز، سحر تاب رومانی، ڈاکٹر ثروت زہرا، فیاض وردگ اور عبدالحمید امیری نے اپنا کلام پیش کیا۔ جبکہ مہمان شعراء میں منظر ایوبی، پروین حیدر، عابدہ سیال اور راقم نے شاعری سنائی اور ہر اچھے شعر پر حاضرین سے خوب داد سمیٹی۔ تقریب میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کے علاوہ فیملیز نے بھی کثیر تعداد میں شرکت کی۔ محفل مشاعرہ کے بعد شعراء کو تحائف دیے گئے اور تقریب کے بعد شرکاء کے لیے بوفے ڈنر کا اہتمام بھی تھا۔ میری زندگی کی یہ یادگار تقریب تھی اور دبئی یاترا اس حوالے سے اور بھی یادگار ہو گئی کہ پرنس اقبال اگلے دن شعراء کو ڈیزرٹ سفاری لے گئے۔ دنیا کی مہنگی ترین فور ویل گاڑیوں پر صحرا نوردی کا مزا ہی کچھ اور تھا۔ اونچے اونچے ٹیلے چشم زدن میں عبور کرتی اور ہچکولے کھاتی گاڑیاں ہمیں شام کو ان خیموں میں لے آئیں جہاں

لذیذ ذائقہ دار پر لطف عربی کھانوں کے ساتھ مصری حسین رقاصاؤں کا بیلے ڈانس جاری تھا۔ اس رقص نے ایسا سماں باندھا کہ صحرا کی شام حسین سے حسین تر ہوتی گئی۔ عربی لباس زیب تن کر کے کلائی اور کندھے پر شاہین بٹھا کے تصاویر بنوائی گئیں۔ نصف شب چاند کی ہمراہی میں گھر لوٹے۔ ڈبئی جائیں اور دنیا کی بلند ترین عمارت برج خلیفہ کا سمندر میں منفرد طرز تعمیر کا شاہکار برج العرب، برج خلیفہ اور مدینۃ الجمیرا دیکھے بغیر لوٹ آئیں تو گویا کچھ نہیں دیکھا۔ یہ کریڈٹ بھی پرنس اقبال کو جاتا ہے کہ انھوں نے ان تینوں جگہوں پر بطور خاص شعراء کے لیے سیاحت کا اہتمام کیا۔ بلکہ برج العرب میں ضیافت زندگی کے چند خوبصورت یادگار لمحات میں سے ایک تھی۔ کرسمس کی آمد پر اسے خوب سجایا گیا تھا۔ یہ دنیا کے قابل دید مقامات میں سے ایک ہے۔ برج خلیفہ کے پہلو میں کھڑے ہو کر دُنیا کے خوبصورت روشنی بکھیرنے والے فواروں کا میوزک پر رقص بھی نہایت دلفریب تجربہ تھا۔ مدینۃ الجمیرا کی خوبصورتی کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تینوں جگہیں سفرنامے میں تفصیلی ذکر کی متقاضی ہیں۔ شارجہ میں مقیم منفرد لہجے کی خوبصورت شاعرہ ڈاکٹر ثروت زہرا نے مہمان شعراء کے اعزاز میں شارجہ یونیورسٹی میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا جس میں یو اے ای کے شعراء نے بھی شرکت کی۔ یہ تقریب بھی اپنی نوعیت کی خوبصورت اور منفرد تقریب تھی جس میں شعراء سے بار بار فرمائش کر کے کلام سنا گیا۔ اس بار یو اے ای میں گزرے دن زندگی کے یادگار دن تھے۔ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی جو کہ ادبی تقاریب کا اہتمام کرتے ہیں اور طویل عرصہ سے دیارِ غیر میں اُردو زبان اور فروغ ادب کے لیے کوشاں ہیں حکومت پاکستان کو ان کی حوصلہ افزائی ضرور کرنا چاہیے۔ خاص طور پر پرنس اقبال گورایا کی تنظیم ایوان اقبال یو اے ای کی کوششوں کو ضرور حکومتی سطح پر سراہا جانا چاہیے۔

President of Pakistan Mr. Asif Ali Zardari conferring President's Award for "Pride of Performance" for Literature and Journalism to renowned Poetess, Writer and Journalist Mohtarma Shahida Latif at the investiture Ceremony held at Aiwan-e-Sadr, Islamabad on March 23, 2013

خوبصورت نعت گو شاعر اور پروڈیوسر علی رضا کے نعتیہ مجموعے ''ثنائے سرورؐ'' کو وزارتِ مذہبی امور کی جانب سے صوبائی سیرت کانفرنس کے موقع پر اوّل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ انعام حمزہ شہباز شریف نے انہیں پیش کیا۔

شارجہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر ثروت کے زیرِ اہتمام محفلِ مشاعرہ کے بعد شعراء (دائیں سے بائیں) ڈاکٹر ثروت زہرا، عابدہ سیال، ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی، منظر ایوبی، پروین حیدر، پرنس اقبال گورایا، ظہور الاسلام جاوید، سلمان احمد، حسن عباسی، فقیر بی مین، فرہاد جبریل، مقصود تبسم، علی سرفراز، کاشف

انجم سلیمی/فیصل آباد

یہیں جی بھر کے مری خاک اُڑائی جائے
خاک داں پر میں دوبارہ نہیں آنے والا

انجم سلیمی 1963 کو فیصل آباد (لائل پور) میں پیدا ہوئے۔ ۸۰ کی دہائی میں لائل پور شہر کی علمی ادبی سرگرمیوں سے منسلک ہوئے۔ انجم سلیمی گزشتہ 3 دہائیوں سے فیصل آباد شہر کے ثقافتی ورثے کی پاسبانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ انجم سلیمی کی اصل پہچان ان کی اردو غزل ہے۔ انجم نے غزلوں کے ساتھ نثری نظم بھی لکھی۔ حال ہی میں اُن کی نثری نظموں کا مجموعہ ''ایک قدیم خیال کی نگرانی میں'' ہم خیال فاؤنڈیشن فیصل آباد سے شائع ہوا۔ ۸۰ کی دہائی کے اہم غزل گوؤں میں انجم سلیمی ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انجم سلیمی کی ایک اور پہچان ان کا رسالہ ''خیال'' ہے جو فیصل آباد کا پہلا باقاعدہ ادبی جریدہ ہے۔ انجم سلیمی اپنی خدمات اور ادب کی تخلیقی حصہ داری کی وجہ سے ایک اہم شخصیت ہے۔ (ارژنگ)

صبر میں اجتہاد چاہتا ہوں
میں لہو میں فساد چاہتا ہوں
کہہ رہا ہے خدا، خداؤں سے
میں حقوق العباد چاہتا ہوں
کر رہا ہوں تجھے خوشی سے بسر
زندگی تجھ سے داد چاہتا ہوں

ظہور کشف و کرامات میں پڑا ہوا ہوں
ابھی میں اپنے حجابات میں پڑا ہوا ہوں
مجھے یقیں ہی نہیں آ رہا کہ یہ میں ہوں
عجب توہم و شبہات میں پڑا ہوں
گزر رہی ہے مجھے روندتی ہوئی دنیا
قدیم و کہنہ روایات میں پڑا ہوا ہوں
بچاؤ کا کوئی رستہ نہیں بچا مجھ میں
میں اپنے خانۂ شہ مات میں پڑا ہوا ہوں
میں اپنے دل پہ بہت ظلم کرنے والا تھا
سو اب جہانِ مکافات میں پڑا ہوا ہوں

بس ایک جسم، ایک ہی قد میں پڑا رہوں
بے حد ہوں میں تو کیوں کسی حد میں پڑا رہوں
صبحِ ازل ہے کب سے مرے انتظار میں
جی چاہتا ہے طاقِ ابد میں پڑا رہوں

اک روز تنگ آ کے مجھے سوچنا پڑا
کب تک میں اپنی صحبتِ بد میں پڑا رہوں
آگے نکلتا جاتا ہوں میں اپنے آپ سے
اب درگزر کروں کہ حسد میں پڑا رہوں
بے سود ہو گیا ہوں تو حاصل کہاں گیا
اے اصل زر! میں کون سی مد میں پڑا رہوں

دن لے کے جاؤں ساتھ اسے شام کر کے آؤں
بے کار کے سفر میں کوئی کام کر کے آؤں
بے مول کر گئیں مجھے گھر کی ضرورتیں
اب اپنے آپ کو کہاں نیلام کر کے آؤں
میں اپنے شور و شر سے کسی روز بھاگ کر
اک اور جسم میں کہیں آرام کر کے آؤں
کچھ روز میرے نام کا حصہ رہا ہے وہ
اچھا نہیں کہ اب اُسے بدنام کر کے آؤں
انجم میں بددعا بھی نہیں دے سکا اُسے
جی چاہتا تو تھا وہاں کہرام کر کے آؤں

ابد کا پہلا کنارہ نظر نہیں آتا
مرے سفر کا اشارہ نظر نہیں آتا
یہ عشق اپنے توکل میں آسمان سا ہے
کسی ستون کا سہارا نظر نہیں آتا

مرا وجود دھڑکنے لگا جسے سن کر
یہ کس نے مجھ کو پکارا، نظر نہیں آتا
خبر نہیں تو چلو خیر و شر سے پوچھتا ہوں
ہے مجھ میں کون صف آراء نظر نہیں آتا
کبھی کبھی تری لو سی اُبھرتی ہے مجھ میں
ابھی تو سارے کا سارا نظر نہیں آتا
یہ کاروبار نہیں دوست! یہ محبت ہے
مجھے تو اس میں خسارہ نظر نہیں آتا
کہاں کی روشنی آنکھوں میں بھر کے لایا ہوں
مجھے چراغ و ستارہ نظر نہیں آتا
جہاں جبینوں پہ شکنیں دکھائی دینے لگیں
میں اس جگہ پہ دوبارہ نظر نہیں آتا

سحر کو کھوج، چراغوں پہ انحصار نہ کر
ہوا سے دوستی رکھ، اس کا اعتبار نہ کر
یقین کر او محبت! یہی مناسب ہے
زیادہ دن مری صحبت کو اختیار نہ کر
یہ کوئی رشتہ نہیں ہے فقط ندامت ہے
تو مجھ سے عمر میں کم ہے سو مجھ سے پیار نہ کر
مجھے پتہ ہے کہ برباد ہو چکا ہوں میں
تو میرا سوگ منا، مجھ کو سوگوار نہ کر

ڈاکٹر جواز جعفری/لاہور

روز آتا تھا بلاوا شاہ کے دربار سے
کہہ دیا میں نے مرا دستِ ہنر مٹی کا ہے

"دلہیز پہ آنکھیں" "مٹی میں ترا وعدہ" اور "موت کا ہاتھ کلائی پر ہے" کی اشاعت کے بعد "محبت خسارہ نہیں" ڈاکٹر جواز جعفری کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ تیس سال پر پھیلے اپنے غیر معمولی تخلیقی سفر کے دوران وہ غزل اور نظم کے ایک قد آور شاعر کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ ڈاکٹر جواز جعفری کے پہلے تینوں شعری مجموعوں میں غزل کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی شامل ہیں مگر زیرِ نظر مجموعے (محبت خسارہ نہیں) کا اختصاص یہ ہے کہ یہ مکمل غزلیہ مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر جواز جعفری کی غزل عصرِ حاضر میں لکھی جاری روایتی غزل سے قدرے مختلف ہے۔ یہ غزل اپنی جدید تر ڈکشن، غیر روایتی زبان، موضوعاتی پھیلاؤ اور اپنے منفرد طرزِ احساس کی بنیاد پر دور ہی سے پہچانی جا سکتی ہے۔ (ارژنگ)

جگر کو خون کیے، آنکھ میں روانی لیے
اداس پھرتا ہوں، چہرے پہ رائیگانی لیے
ہوا ہے شہر پہ قابض مرا عدو اور میں
بھٹکتا پھرتا ہوں جنگل میں راجدھانی لیے
جمالِ دیر نما! برف ہو گئے مرے بال
کبھی میں آیا تھا اس شہر میں جوانی لیے
اجڑنے والی تھی وہ داستاں سرائے کہ پھر
پہنچ گیا میں وہاں اک نئی کہانی لیے
اسیرِ رزق و مکاں! بام سے کبھی مجھے دیکھ
میں تیرے کوچے میں پھرتا ہوں زندگانی لیے
عدو کے نرغے میں دانتوں سے تھامے مشکیزہ
یہ کون ہے جو چلا آ رہا ہے پانی لیے؟
جواز میں تو ازل سے اسیرِ خاک ہوں اور
یہ کائنات ہے دامن میں بے کرانی لیے

جو ہمسفر بھی چلا، دو قدم چلا، مرے ساتھ
تمام عمر چلا۔ صرف راستہ مرے ساتھ
کبھی پڑا تھا مری چشمِ تر میں ریزۂ خواب
پھر اس کے بعد مسلسل ہے رت جگا مرے ساتھ
اندھیرا پھیلا تو جنگل میں بجھ گئی مری آنکھ
کسی دعا کا دیا رات بھر جلا مرے ساتھ
کچھ اس لیے بھی نہیں ہے مرے نفس کو دوام
رواں، ازل سے ہے اندیشۂ فنا مرے ساتھ
وہ میری موج میں تھا، گو عدو کی فوج میں تھا
وغا چھڑی تو بجتر میں آ ملا، مرے ساتھ
مرے بدن کو ہے بحرانِ خال و خط درپیش
اسی لیے ہے شب و روز آئینہ مرے ساتھ
تجھے دکھاؤں میں ہمسائی کہکشاں کا جمال
زمیں کو چھوڑ، کبھی آسماں پہ آ مرے ساتھ
یہ کیا کہ اب مجھے پہچانتا نہیں تو بھی
بچھڑنے والے ترے غم نے کیا کیا مرے ساتھ
کھلا ہوا جو کسی اور شاخ پر تھا جواز
ستم تو یہ ہے کہ وہ عمر بھر جیا مرے ساتھ

ابھی تھا تکیے کے نیچے پڑا، یہاں مرا خواب
چرا کے لے گئی اک چشمِ مہرباں مرا خواب
میں اپنے بچوں کی آنکھوں میں بو رہا ہوں، اسے
کہ میرے بعد رہے یوں ہی جاوداں، مرا خواب
پکڑ رہا ہے یہ اُس خاکِ چشمِ سبز میں جڑ
سو، شاخِ زرد پہ کھل پائے گا کہاں مرا خواب
کھلی جو آنکھ تو پل میں بجھ گئی تعبیر
کسے خبر تھی کہ جائے گا رائیگاں مرا خواب
رواں، ازل سے ہے ارض و سما کی یہ چکی
سو پس رہا ہے دو پاٹوں کے درمیاں مرا خواب
کہ اس سے پہلے کھنڈر ہو زمین کی وادی
خلاء میں تیرتی آسودہ بستیاں مرا خواب
جہاں سے کوئی کڑی گم تھی، اس کتھا کی جواز
وہیں سے آگے سناتا ہے داستاں مرا خواب

خواب کو گھول کے اشکوں میں بنائی ہوئی ہے
ایک تصویر جو آنکھوں میں سجائی ہوئی ہے
مہکی مہکی ہوئی آتی ہے سرِ شام ہوا
تازہ تازہ کہیں پھولوں کی چنائی ہوئی ہے
مجھ سے کترا کے گزر، قافلۂ رنگِ بہار
کہ جنوں خیزی مری رنگ پہ آئی ہوئی ہے
اس لیے آنکھ بھر آئی ہے کہ مجھ کو یہ کتھا
میرے بچپن میں مری ماں نے سنائی ہوئی ہے
پھر سرِ شام بدلنے لگا موسم کا مزاج
جانتا ہے مری فصلوں کی کٹائی ہوئی ہے
اسی مدفن سے ملے گا مرے ماضی کا سراغ
جس کھنڈر کی ابھی دو ہاتھ کھدائی ہوئی ہے

ریاض ندیم نیازی/ سبی

اک شام اُس کی باتوں میں تلخی تھی اس قدر
جیسے کسی نے زہر ملایا ہو چائے میں

صبر انتہا کا تھا بات سب رضا کی تھی
شام تھی غریبوں کی رات کربلا کی تھی
اُس کی سلطنت سے میں، بھاگ کر کہاں جاتا
آسماں خدا کا تھا یہ زمیں خدا کی تھی
وہ جو گونگے لفظوں کو بولنا سکھاتا ہے
یقین کی مجھ کو یہ دولت اُس نے ہی عطا کی تھی
پاس میرے جو بھی ہے سب عطا اُسی کی ہے
میں نے صرف محنت کی ماں نے تو دُعا کی تھی
میرے دل میں جو کچھ تھا کہہ دیا زمانے سے
سچ ہی میں نے بولا تھا کون سی خطا کی تھی
پوچھ میر و غالب سے پوچھ قیس و مجنوں سے
رسم جو وفا کی تھی کس نے ابتدا کی تھی
سنگ جس نے برسائے اُس کو بھی دُعائیں دیں
اے ندیم یہ سنت میں نے بھی ادا کی تھی

ہر ایک اپنے قبیلے کی جنگ لڑتا رہا
میں سچے لفظوں کے پرچم بلند کرتا رہا
ادھورا رہ گیا میرے وجود کا خاکہ
میں اپنے بچوں کے خوابوں میں رنگ بھرتا رہا
کسی سے پوچھ ہی لیتا میں اپنے گھر کا پتا
میں ایک راہ سے ہر بار کیوں گزرتا رہا
کوئی نہیں تھا، مگر وقت آئینہ تھا مرا
اُسی کو دیکھ کے بنتا رہا، سنورتا رہا

تری خوشی کے لیے خواب جو تراشے تھے
میں اپنے آنسوؤں سے ان میں رنگ بھرتا رہا
عجیب ہوتا ہے یک طرفہ عشق کا عالم
کوئی سنورتا رہا اور کوئی بکھرتا رہا
جو آگہی کی صلیبوں پہ کٹ رہی تھی ندیم
تمام عمر اُسی زندگی پہ مرتا رہا

کروں پرچھائیوں جیسا سفر، اچھا نہیں لگتا
مجھے چلنا کسی کی راہ پر، اچھا نہیں لگتا
مرا دُکھ شعر کی صورت جو کاغذ پر اُترتا ہے
مٹا دیتا ہوں خود اس کو اگر، اچھا نہیں لگتا
وہ جن کے دل ملے ہوں گے وہی بے خوف ملتے ہیں
محبت ہو تو رُسوائی کا ڈر، اچھا نہیں لگتا
وہ چاہے خواب جھوٹے ہی سجا لے اپنی آنکھوں میں
مکیں جس میں نہیں رہتے وہ گھر اچھا نہیں لگتا
نگر پر آ گیا ہو جب صلیب و دار کا موسم
کسی سرکش کو بھی شانوں پہ سر اچھا نہیں لگتا
بچھڑ کر جب بھی تجھ سے آسماں پر چاند کو دیکھا
حسیں لگتا ہے وہ مجھ کو مگر، اچھا نہیں لگتا
میں چھاؤں میں اگر ٹھہرا تو منزل رُوٹھ جائے گی
ندیم اب راہ میں کوئی شجر اچھا نہیں لگتا

جو لڑ رہا تھا دیا رات کے اندھیرے سے
وہی ملائے گا ہم کو نئے سویرے سے
لہو سے ڈوبی ہوئی زندگی کا پس منظر
خموش نکلتا ہے درویش اپنے ڈیرے سے
مری جوانی کا پیتل یا حسن کا سونا
بچا ہے کون یہاں وقت کے لٹیرے سے
ڈھلے گا دن تو پھر آنکھوں میں خواب اُتریں گے
پرندے شام تلک دور ہیں بسیرے سے
یہ میری ماں کی دُعاؤں کے سب ہی سائے ہیں
جو رنگ و نور کے ہیں میرے گرد گھیرے سے
جو انقلاب تھا آنا وہ آ گیا ہے کیا
کسان ہو گئے آزاد کیا وڈیرے سے
حیات کانٹوں میں کاٹی تو ہے ندیم مگر
اُٹھے گی پیار کی خوشبو مگر خمیرے سے

شامل ہو کوئی کیسے بھلا میری رائے میں
پہلے تمیز کر تو لوں اپنے پرائے میں
مجھ کو خبر ہے میری جڑیں کاٹ ڈالیں گے
احباب جو ہیں بیٹھے ہوئے میرے سائے میں
دل میں مرے ہوا ہے مکیں اک عجیب شخص
دیتا ہے زخم دل مجھے گھر کے کرائے میں
اک شام اُس کی باتوں میں تلخی تھی اس قدر
جیسے کسی نے زہر ملایا ہو چائے میں
مجھ کو بلا رہی ہے کسی کے بدن کی دُھوپ
میں جل رہا ہوں جھوٹی اناؤں کے سائے میں

محمد ندیم بھابھہ / ایلسی

بس اتنا سوچ کر ہی مجھ کو اپنے پاس تم رکھ لو
تمہارے واسطے میں حکمرانی چھوڑ آیا ہوں

ندیم بھابھہ نے عشق کیا ہے مجاز سے حقیقت تک اور پھر حقیقت سے لباسِ مجاز میں بیان کرنے تک برتا ہے کہیں کہیں وہ واردات ہو گیا ہے۔ شاید صوفیانہ تجربہ مکمل طور پر اس کی گرفت میں نہیں آیا لیکن اکثر مقامات پر وہ کامیاب ہوا ہے اور اس نے ایک ایسا صوفیانہ لہجہ دریافت کیا ہے جس کی نقالی تو آپ کو مل جائے گی لیکن اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ یہ سروری قادری شعر کو دعا مانگنے کا عمل سمجھتا ہے۔ دعائیں مانگی ہیں میں نے تو شاعری نہیں کی در بِ اظہار کے ہاں دعا مانگنے والا کبھی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ اسے چشمِ مرشد لوحِ محفوظ پر لکھا ہوا تعلیم کر دیا جاتا ہے۔ ندیم بھابھہ جب اس سلسلے سے فیضیاب ہوتا ہے تو اس کے لہجے کی سرشاری اس کے ایک ایک مصرعے سے ٹپکتی ہے۔ میرے خیال میں اپنے ہم عمر اور ہم عصر گروہ میں ندیم بھابھہ واحد عاشق اور صوفی شاعر ہے جو عشق کا ڈھنڈورا پیٹنے کی بجائے عشق کی سلامتی چاہتا ہے اور یہاں وہ اپنے دادا مرشد سلطان باہو کا ہم آواز ہو جاتا ہے۔ (عباس تابش)

دل صورت ہے اب یار کی اور جسم پرویا عشق میں
مرا حسن مکمل ہو گیا، میں اتنا کھویا عشق میں
میں پاپی، کوڑھی عشق کا، میں کی اپنے یار کا
مری ساری میل اُتاری دی، سرکار نے دھویا عشق میں
میں شورزدہ اک خاک تھا، مرا وارث مجھ میں آ بسا
مرے آنسو میٹھے ہو گئے، میں اتنا رویا عشق میں
مرا رنگ سنہری گندمی، مری سروری قادری چال ہے
اک یاد ہے میری زندگی، میں جاگا سویا عشق میں

تمام عمر جلے اور روشنی نہیں کی
یہ زندگی ہے تو پھر ہم نے زندگی نہیں کی
ستم تو یہ ہے کہ میرے خلاف بولتے ہیں
وہ لوگ جن سے کبھی میں نے بات بھی نہیں کی
جو دل میں آتا گیا صدقِ دل سے لکھتا گیا
دعائیں مانگی ہیں میں نے تو، شاعری نہیں کی
بس اتنا ہے کہ مرا بخت ڈھل گیا اور پھر
مرے چراغ نے بھی مجھ پہ روشنی نہیں کی
مری سپاہ سے دُنیا لرزنے لگتی ہے
مگر تمہاری تو میں نے برابری نہیں کی
کچھ اس لیے بھی اکیلا سا ہو گیا ہوں ندیم
سبھی کو دوست بنایا ہے دشمنی نہیں کی

محو ہنر ہوں سنگ یا تیشہ کوئی تو ہو
سر پھوڑنے کا آج بہانہ کوئی تو ہو
سوچا تھا کٹ ہی جائے گی تنہا تمام عمر
لیکن تمام عمر، خدارا کوئی تو ہو
اک عمر بن ملے ہی کٹی اور ایک عمر
یہ سوچتے کٹی کہ بہانہ کوئی تو ہو
تنہائی اس قدر ہے کہ عادت سی ہو گئی
ہر وقت کہتے رہنا ہمارا کوئی تو ہو
کچھ اس لیے بھی تم سے محبت ہے مجھ کو دوست
میرا کوئی نہیں ہے تمہارا کوئی تو ہو
کمرے میں آج میرے علاوہ کوئی نہیں
کمرے میں آج میرے علاوہ کوئی تو ہو

قیس و لیلیٰ کا طرفدار اگر مر جائے
میں بھی مر جاؤں یہ کردار اگر مر جائے
پھر خدایا! تجھے سورج کو بجھانا ہوگا
آخری شخص ہے بیدار اگر مر جائے
چھپنے والے تو بھی سوچ کہ اک دن بالفرض
یہ مری خواہشِ دیدار اگر مر جائے
باندھ رکھی ہے قبیلے نے توقع جس سے
اور اچانک ہی وہ سردار اگر مر جائے
عین ممکن ہے مرا نام بھی آ جائے کہیں
شہرِ لیلیٰ کا گنہگار اگر مر جائے
منتظر جس کی یہ آنکھیں ہیں کئی برسوں سے
اور وہ چاند بھی اس پار اگر مر جائے

چاند روشن ہے تو بس شب کی اذیت تک ہے
جانتا ہوں کہ ترا ساتھ ضرورت تک ہے
ایک کردار کہانی کے لیے میں بھی ہوں
اور صحرا بھی مری آخری ہجرت تک ہے
تو نہیں ہوتا اگر، کس نے یہاں رہنا تھا
دوست یہ گھر بھی فقط تیری سکونت تک ہے
انتہا کوئی تو ہو تیری طرف سے مری جاں
منتظر تیرا کوئی شخص قیامت تک ہے
اپنی تنہائی سے پوچھوں گا اگر پوچھ سکا
کیا یہ سچ ہے کہ ہر اک دوست سہولت تک ہے
مر گئے لوگ یہاں سارے مگر اب بھی ندیم
کوئی زندہ ہے اگر اُس کی محبت تک ہے

شہزاد بیگ/فیصل آباد

منتظر ہوں تری دیوار کے سائے میں ترا
مجھ کو معلوم ہے دیوار میں در ہوتا ہے

شہزاد بیگ کی ذاتی زندگی کے تجربات وہی ہوں گے جو اس عہد کے ایسے افراد کا مقدر بن چکے ہیں جنہیں زندگی کے مسائل کا شعور بھی رکھتا ہے اور ذاتی یا اجتماعی غم سے شکست بھی نہیں کھائی ہے۔ شہزاد بیگ نے زندگی کے وہ رخ اپنی شاعری میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جو دوسرے انسانوں کے تجربات کا حصہ ہیں لیکن وہ انہیں کوئی تخلیقی یا جمالیاتی زاویے بخشنے سے قاصر ہیں۔ ایسے انسانوں کی ترجمانی شہزاد بیگ نے خوب کی ہے۔ یہی جواز کسی بھی شاعر کو پڑھنے کے لئے کافی ہوتا ہے کہ وہ حساس "اکائی" کے طور پر اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے بھی کچھ لکھے لیکن یہ محسوس نہ ہو کہ شاعر اپنے خول سے باہر نکلنا نہیں چاہتا۔ شاعر خواہ کتنا ہی دروں بین اور داخلیت پسند ہو لیکن اس کا کوئی ربط اور تخلیقی مکالمہ اپنے سے باہر کی دنیا سے بھی ہونا چاہئے۔ شہزاد بیگ کا سفر انہی پگڈنڈیوں پر جاری ہے شہزاد بیگ توجہ اور انہماک سے لکھ رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اب جو ان کا کلام مجموعے "اکائی" کی شکل میں سامنے آ رہا ہے، شہزاد بیگ کی شاعری کے امکانات پر گفتگو کے دروازے کھلیں گے۔ (سحر انصاری)

شہر تہمت میں بہت دیر پکارا ہوا ہوں
میں جو اک شخص ترے عہد میں مارا ہوا ہوں
مری تنہائی مجھے روز ترا پوچھتی ہے
میں جو دنیا کے مقابل تجھے ہارا ہوا ہوں
منجمد تھا میں کسی بحر شمالی کی طرح
اک ترے ہاتھ لگا دینے سے پارا ہوا ہوں
اپنی بربادی کا جب جشن منایا میں نے
تب کہیں جا کے تجھے جان سے پیارا ہوا ہوں
ہر کوئی ہاتھ میں تلوار لیے بیٹھا ہے
میں تو جیسے کسی مقتل میں اتارا ہوا ہوں
یہ ہوا ہی مجھے کہیں لے جائے گی شہزاد کہیں
ریت پر نقش کی صورت جو ابھارا ہوا ہوں

عجب عشق ہوا ہے مجھے گمان کے ساتھ
ہر ایک شہر کو چھانا ہے اس تھکان کے ساتھ
منافقوں نے میرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں
سو مجھ کو وار بھی کرنا ہے اب زبان کے ساتھ
اب اچھے لوگ جو نایاب ہوتے جاتے ہیں
گزر بسر ہے مری اب تو میری جان کے ساتھ
میں جن کے واسطے رستہ بنانا چاہتا ہوں
شمار کرتے ہیں مجھ کو بھی وہ چٹان کے ساتھ
ہر ایک دوست صف دشمناں میں شامل ہے
جبھی تو بنتی نہیں مری اس جہان کے ساتھ
مخالفین سے دب کر نہیں رہوں گا میں
میں سر اٹھا کے چلوں گا ہمیشہ شان کے ساتھ
مری تباہی کا دن رات سوچنے والے
لگائے بیٹھے ہیں خیمے مرے مکان کے ساتھ

جب مجھے راہ سے ہٹایا گیا
اس قدر شور کیوں مچایا گیا
جس گلی تک تھا اس کا نقش قدم
اس گلی تک بھی میرا سایہ گیا
اس قدر اس کو مجھ سے نفرت تھی
شہر حسرت تھا کیوں بسایا گیا؟
میں کہاں مانتا تھا دنیا کی
تیرا کہہ کر مجھے منایا گیا
سنسنی سی بدن میں پھیل گئی
جب مجھے آئنہ دکھایا گیا
مجھ کو اے شہر تیری گلیوں میں
پابہ زنجیر کیوں پھرایا گیا
ہم نے کیا دکھ سہے زمانے کے
پیاس کو اشک سے بجھایا گیا
میں تو دنیا کو روند بیٹھا تھا
مجھ میں کس شخص کو جگایا گیا
تیرے ہونٹوں سے چوس کر شبنم
مجھ کو زہراب ہی پلایا گیا
اس جگہ پھول ہے نہ تتلی ہے
جس جگہ دل مرا بچھایا گیا
مجرم عشق تھے سبھی شہزاد
دار پر کیوں مجھی کو لایا گیا

رات کٹتی ہے نہ اب دن ہی بسر ہوتا ہے
شام کب ہوتی ہے کب وقت سحر ہوتا ہے
منتظر ہوں تری دیوار کے سائے میں ترا
مجھ کو معلوم ہے دیوار میں در ہوتا ہے
بادشاہت تو کسی وقت بھی چھن سکتی ہے
کام آتا ہے جو ہاتھوں میں ہنر ہوتا ہے
میں کسی اور ہی منزل پہ ٹھہر جاتا ہوں
قافلہ جب بھی مرا محو سفر ہوتا ہے
زندگی ساری تو بس یونہی گزر جاتی ہے
وقت جو پیار میں گزرے وہ امر ہوتا ہے
اس گئے دور میں شہزاد غنیمت ہے یہی
میرے شانوں پہ مرا اپنا ہی سر ہوتا ہے

جیسے ہوں عیاں دل پہ ستارا تری آنکھیں
لگتی ہیں سمندر کا کنارا تری آنکھیں
ہم ہوش میں آنے کا کبھی نام نہ لیتے
بن جائیں اگر دوست سہارا تری آنکھیں
ہوتی تھیں بہت دیر ترے حسن پہ باتیں
دیتی تھیں بہت دیر نظارہ تری آنکھیں

اظہر عباس/شیخوپورہ

مری کہانی تری کہانی سے مختلف ہے ——— کہ جیسے آنکھوں کا پانی، پانی سے مختلف ہے

اظہر عباس کی غزلیں جدید غزل کے سرمایہ میں اہم اضافہ ہیں۔ان کی غزل اپنی سادگی، گہرائی اور بے ساختہ پن کے باوصف متوجہ کرتی ہے۔ان کے دو عدد شعری مجموعے "سبز رتوں کے خواب" (ہائیکو) اور گھروندا (غزلیں، نظمیں) شائع ہو چکے ہیں۔جبکہ تیسرا شعری مجموعہ ان دنوں طباعت کے مراحل میں ہے۔اظہر عباس کی شاعری کا عمومی رنگ انسانی احساسات اور اس کے لطیف اظہار پر مشتمل ہے جس میں زندگی کے رنگ جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ان کی شاعری براہ راست اظہار کے باوجود جذبے کی گہرائی سے تہہ داری حاصل کرتی ہے جو اسے زیادہ سے زیادہ قارئین کے لیے قابل قبول بناتی ہے۔(ارشد نعیم)

مری کہانی تری کہانی سے مختلف ہے
کہ جیسے آنکھوں کا پانی، پانی سے مختلف ہے
وہ ایک لمحہ جو دسترس میں نہیں رہا ہے
وہ زندگی بھر کی رایگانی سے مختلف ہے
میں دشتِ وحشت کی ریت ہوں اور تو ایک دریا
مری روانی، تری روانی سے مختلف ہے
مجھے ترے ساتھ مل کے رونا تو ہے مگر دوست
یہ میرا غم تیری نوحہ خوانی سے مختلف ہے
یہ ہم جہاں زندگی بسر کر رہے ہیں اظہر
وہ اپنے خوابوں کی راجدھانی سے مختلف ہے

کوئی بتائے عشق نے ہم کو دیا تو کیا دیا
میں نے بھلا دیا اُسے مجھے بھلا دیا
آنکھوں میں کوئی نم نہ تھا جیسے کسی کا غم نہ تھا
ایسا نجانے کیا ہوا، جس نے مجھے رُلا دیا
ہارا تھا جب میں عشق میں، کوئی نہ آیا پوچھنے
ایسا مقام تھا کہ میں نے خود کو ہی حوصلہ دیا
مجھ کو بہت عزیز تھی برسوں کی نیند تھی مری
جانے وہ کیسا خواب تھا جس نے مجھے جگا دیا
ایسا وہ کون ہے یہاں جس کو ہوا کا ڈر نہیں
ایسی اندھیری رات میں کس نے دیا جلا دیا
اُس کا بھی راستہ تھا اور میرا بھی راستہ تھا اور
چلنا پڑا جو ایک ساتھ، اس نے ہمیں تھکا دیا

میری مثال کون تھا، میری مثال کون ہے
روئے گا عمر بھر اگر تو نے مجھے گنوا دیا

دیکھ قندیلِ رُخِ یار کی جانب مت دیکھ
تیز تلوار ہے، تلوار کی جانب مت دیکھ
بول کتنی ہے ترے سامنے قیمت میری
چھوڑ بازار کو، بازار کی جانب مت دیکھ
دیکھنا ہے تو مجھے دیکھ کہ میں کیسا ہوں
میرے اُجڑے ہوئے گھربار کی جانب مت دیکھ
اور بڑھ جائے گی تنہائی تجھے کیا معلوم؟
ایسی تنہائی میں دیوار کی جانب مت دیکھ
آگے نکلا ہے تو پھر آگے نکلتا چلا جا
پیچھے ہٹتے ہوئے سالار کی جانب مت دیکھ
تو کہانی کے بدلتے ہوئے منظر کو سمجھ
خون روتے ہوئے کردار کی جانب مت دیکھ
دیکھ، زنداں پہ جو گزری ہے مرے آنے سے
آج تو اپنے گرفتار کی جانب مت دیکھ

یہ رات آخری لوری سنانے والی ہے
میں تھک چکا ہوں، مجھے نیند آنے والی ہے
ہنسی مذاق کی باتیں یہیں پہ ختم ہوئیں
اب اس کے بعد کہانی رُلانے والی ہے
اکیلا میں ہی نہیں جا رہا ہوں بستی سے
یہ روشنی بھی مرے ساتھ جانے والی ہے

ابھی تو کوئی بھی نام و نشاں نہیں اُس کا
ہمیں جو موج کنارے لگانے والی ہے
ہر ایک شخص کا یہ حال ہے کہ جیسے یہاں
زمین آخری چکر لگانے والی ہے
یہ ایک عشق قیامت سے کم نہ تھا اظہر
سنا ہے اور مصیبت بھی آنے والی ہے

ایسے پامال کہ پہچان میں آتے ہی نہیں
پھول سے چہرے مرے دھیان میں آتے ہی نہیں
روک لیتی ہے کہیں راہ میں نوحوں کی صدا
خوش نوا گیت مرے کان میں آتے ہی نہیں
یوں تو کیا کیا نہ لیا زادِ سفر چلتے ہوئے
چند سپنے ہیں جو سامان میں آتے ہی نہیں
جرم ایسا ہے کہ مجرم ہیں سبھی شہر کے لوگ
اور اسیر اتنے کہ زندان میں آتے ہی نہیں
اس طرف لڑنے پہ آمادہ ہے لشکر اپنا
اور سالار کہ میدان میں آتے ہی نہیں
ایسے سپنے ہیں جنہیں ہم نے نہیں دیکھا ابھی
ایسے رستے ہیں جو امکان میں آتے ہی نہیں

حرا رانا / لاہور

عجب سلسلہ ہے نمازِ محبت قضا کر کے روئے، ادا کر کے روئے

حرا رانا کی شاعری کے موضوعات ان کی زندگی کے گرد گھومتے ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری ان کی آپ بیتی ہے۔ ان کا اوّلین شعری مجموعہ "اگلا موڑ جدائی ہے" شائع ہوا تو اسے ادبی اور عوامی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی ملی۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ "ردائے عشق" کے نام سے جلد منظر عام پر آنے والا ہے۔ حرا رانا اپنے منفرد اسلوب اور دل پذیر شاعری کے باعث عوامی حلقوں میں کافی مقبول ہیں اور ملک اور بیرونِ ملک مشاعروں میں شرکت کرتی رہتی ہیں۔ (ارژنگ)

گود اپنی میں کبھی سر کو جھکا کر روئے
اور ہاتھوں میں کبھی چہرہ چھپا کر روئے
ایک تو ہی تو نہیں مل کے پریشاں ہم سے
زندگی ہم بھی ترا ساتھ نبھا کر روئے
شہر سارا ہی سبب پوچھنے آ بیٹھا ہے
ہم تری یاد میں یوں ہاتھ اُٹھا کر روئے
کوئی اپنا ہی نہیں کس کو سنائیں جا کر
کون سا روگ یہ ہم جاں کو لگا کر روئے
زخم ایسے تھے ترے ہجر کے جھیلے نہ گئے
ہم کسی غیر کی بانہوں میں سما کر روئے
کائی جمنے ہی نہیں دی ہے تری یادوں پر
موج در موج ترا نام سجا کر روئے
وہ حراؔ جس نے محبت کی دعا مانگی تھی
اب سرِ شام چراغوں کو بجھا کر روئے

ناکام حسرتوں کا ہے نیلام اور میں
بجھتے ہوئے چراغ لبِ بام اور میں
آنکھوں پہ ہر ہے پاؤں میں چکر پڑا ہوا
چاروں طرف ہے گردشِ ایام اور میں
مجھ سے ملیں تو حال ترا پوچھتے ہیں لوگ
اب بھی قریب تر ہیں ترا نام اور میں
کچھ اور بھی تھے لوگ محبت کی راہ پر
بدنام تم ہوئے ہو سرِ عام اور میں

گھر کا پتہ نہ اُس کو نہ مجھ کو خبر کوئی
رستے میں رہ گئی ہے کہیں شام اور میں
چھوڑا ہے ایسے موڑ پہ اُس نے مجھے حراؔ
ہر سمت راستوں کا ہے ابہام اور میں

لوٹ کر آتا نہیں کوئی بھی ایسا کیا ہے
پسِ دیوار خدا جانے تماشا کیا ہے
اس کو بن دیکھے تری سانس جو رُک جاتی ہے
عشق میں پہلا پڑاؤ ہے اُلجھتا کیا ہے
یونہی مجبور ہوئے جاتے ہیں دل کے ہاتھوں
ورنہ اس شہرِ تمنا میں بھی رکھا کیا ہے
یہ دُھواں سا جو مری آنکھ کو نم رکھتا ہے
جانے دن رات یہ سینے میں سلگتا کیا ہے
یوں سرِ راہ تمہیں حال سناؤں کیسے
تم کبھی بیٹھ کے پوچھو مرا جھگڑا کیا ہے
جاں ہتھیلی پہ، چراغوں میں ہیں رکھ دیں آنکھیں
اے شبِ ہجر بتا اور تقاضا کیا ہے
پھر سے وہ کرنے لگا مہر و وفا کی باتیں
دل کو سمجھا تو حراؔ دل کا بھروسہ کیا ہے

ساتھ تیرا ہو یا تنہائی کا
کام کرتا ہے مسیحائی کا
اس کی باتیں تو ہیں نشتر جیسی
امتحاں میری شکیبائی کا

اس کی محفل ہے، عدو ہے، ہم ہیں
کیا کریں ہم دلِ سودائی کا
کہنے کو مجھ سے مخاطب ہے وہ
اور چرچا کسی ہرجائی کا
آنکھ اُٹھتی نہ قدم اُٹھتے ہیں
کس قدر بوجھ ہے رُسوائی کا
شاعری دادطلب ہے اپنی
ہائے یہ شوق پذیرائی کا
ہم محبت میں پڑے لوگوں سے
کیا تقاضہ ہے یہ دانائی کا
ایک مدت سے نہیں سوئے حراؔ
خواب کیسا ہے یہ انگڑائی کا

اشک پلکوں میں چھپا کر سو جا
خواب آنکھوں میں بسا کر سو جا
عشق رُسوائی میں پلتا ہے سدا
سارے الزام بھلا کر سو جا
پھر کسی درد نے سرگوشی کی
مجھ کو سینے سے لگا کر سو جا
سارے خدشات مٹا دے دل سے
اس کے ملنے کی دعا کر سو جا
لوٹتے کب ہیں یہ جانے والے
دیکھ یوں ضد نہ حراؔ کر، سو جا

نوید انور/شارجہ

میں جو دو میم لیے پھرتا ہوں ہفت اقلیم لیے پھرتا ہوں

نوید انور سنجیدہ لہجے میں غزل کہنے والے ابھرتے ہوئے شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ادبی حلقوں میں بھی سرگرم عمل ہیں۔ حلقہ اربابِ ذوق کے ممبر ہیں اور ادبی تنظیم "روش" کے نائب صدر کے طور پر خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ نوید کی شاعری، بالخصوص پنجابی شاعری جدید لب ولہجے اور روایت کے امتزاج کا اچھا نمونہ ہے۔ عصری شعور، شعری لطافت اور جذبہ واحساس کی آمیزش ان کی شاعری کے نمایاں عناصر ہیں۔ نوید انور کا پنجابی مجموعہ کلام "جنت میرے گھر دی" زیر طبع ہے۔ جبکہ اردو شاعری کا مجموعہ ترتیب کے آخری مراحل میں ہے۔ ان دنوں وہ بسلسلہ روزگار شارجہ میں مقیم ہیں۔ (ارژنگ)

میں اک بار کی چوکھٹ تک جب ڈرتا ڈرتا آیا
دیکھا ایک ہجوم ہے اس تک بڑھتا چڑھتا آیا
قرنوں سے میں تشنہ تھا اور سوکھے ہونٹ تھے میرے
چشمے تک مجھے آنا تھا سو گرتا پڑتا آیا
تم کو بھی ہے اس دنیا سے جانا خالی ہاتھ
بے منزل کی ہر کشتی میں اپنی پڑتا آیا
مجھ پر خود سے چڑھ آیا روز و شب کا ڈھلنا
لمحہ لمحہ روز و شب میں میں پھر ڈھلتا آیا
رُکنے سے یوں رک جاتی تھی انور میری سانس
خار بھرا تھا ہر اک رستہ لیکن چلتا آیا

کٹتے کٹتے، کٹتے ہیں یہ دشواری سے دن
آ جاتے ہیں اک اک کر کے پھر باری سے دن
چلتے چلتے تھک جاتا ہے سورج میرے ساتھ
خواب سہانے پی لیتا ہے فن کاری سے دن
جیسے تیسے کٹ جاتی ہے لمبی کالی رات
جیسے تیسے کٹ جاتا ہے بیزاری سے دن
کھاتے کھاتے چھوٹ گرا جب مجھ سے ایک نوالہ
سوچا کیسے کٹتے ہوں گے اک ہاری سے دن
اس کو دیکھوں تو آنکھوں میں جل جاتے ہیں دیپ
آنگن میں جب پھول کھلے تو گلکاری سے دن

میں جو دو میم لیے پھرتا ہوں
ہفت اقلیم لیتے پھرتا ہوں
آ گہی کھول کوئی عقدۂ جاں
خوءِ تسلیم لیے پھرتا ہوں
ایک دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں
میں جو تعلیم لیے پھرتا ہوں
اک تصنع کا تماشا ہے جہاں
اور میں تفہیم لیے پھرتا ہوں
موجہ غم کے تسلط میں نوید
دل کو دو نیم لیے پھرتا ہوں

تاروں کو جب بزم سجانی ہوتی ہے
لمحوں کو اک رات بچھانی ہوتی ہے
ہوتے ہوتے گنجلک ہوتی جاتی ہے
جیسے جیسے بات پرانی ہوتی ہے
اس کو کیا ہے خواب جلے یا دل جل جائے
اس نیتو بس آگ لگانی ہوتی ہے
دریا نے جب موج میں آنا ہوتا ہے
دریا میں اس وقت روانی ہوتی ہے
اک لمحہ ہی فیصل ہوتا ہے انور
اک لمحے میں عمر بتانی ہوتی ہے

خواب اتنے بے بہا دل جلانے کے لیے
انبساطِ زندگی بس فسانے کے لیے
بخش دی تقدیر نے ہم فقیروں کو یہی
چار دن کی زندگی آزمانے کے لیے
دیدۂ تر تو مرا درد تصویر ہے
ہونٹ ہیں تاسف زدہ مسکرانے کے لیے
شام کی دہلیز پر اپسرائے آرزو
آ گئی ہے اور سے دل لگانے کے لیے
دیکھئے تو عکس گاہ ہے خواب ہے یہ زندگی
سوچئے تو قید خانہ چھڑ چھڑانے کے لیے

لیے اک چاند سا چہرہ محبت کے سمندر تک
چلی آتی ہے پگڈنڈی ترے گھر سے مرے گھر تک
مجھے کچھ پوچھنا ہے اور مجھے کچھ سیکھنا بھی ہے
کتابو تم ہی لے جاؤ مجھے میرے پیمبر تک
خمارِ عشق میں ہوں میں تمہارے عشق میں ہوں میں
کھچا آتا ہے میرا دل مجھے لے کر ترے در تک
شہادت ہو مرا جینا شہادت ہو مرا مرنا
مرے جذبے شہادت تو مجھے لے جا بہتر تک

ڈاکٹر محمد عثمان/پشاور

وہ کون ہے جو رہتا ہے خالی مکان میں
آواز مجھ کو دیتا ہے اکثر تمام رات

ڈاکٹر محمد عثمان کا شمار بہت ہی توانا اور جدید غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری سادہ، آسان اور شگفتہ ہے۔ وہ عموماً چھوٹی بحر میں غزل کہتے ہیں۔ ان کے موضوعات منفرد اور اچھوتے ہیں۔ ان کی شاعری کی تازگی سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے اندر ایک جہان نو آباد ہے۔ ڈاکٹر محمد عثمان کی شاعری روایت اور جدت کا حسین امتزاج ہے۔ اپنی شاعری کی طرح وہ خود بھی دلپذیر شخصیت کے مالک ہیں۔ (ارژنگ)

لپٹا رہا اُداسی کا منظر تمام رات
روتا رہا ہے کون یہ چھپ کر تمام رات
کیا اس کے دل میں حسرتِ تعمیر مر گئی
سڑکوں پہ پھر رہا تھا جو بے گھر تمام رات
اس کا سہاگ شہر کے حالات کھا گئے
سُونا رہا دُلہن کا وہ جھومر تمام رات
آوارگی نے مجھ سے چھڑایا تھا گھر مرا
تنہا پڑا رہا مرا بستر تمام رات
اک چاند گھر کے صحن میں اُترا مرے لیے
تھا مہربان مجھ پہ مقدر تمام رات
بھیگے ہوئے بدن کی وہ خوشبو عجیب تھی
بھڑکا رہا تھا شعلوں کو اک شر تمام رات
وہ کون ہے جو رہتا ہے خالی مکان میں
آواز مجھ کو دیتا ہے اکثر تمام رات
پھر میں نے خواہشات کے سب پر کتر دیے
اُڑتے رہے بدن میں کبوتر تمام رات
بستی میں کیا ہوا ہے کوئی پھر سے سانحہ
طاری رہا ہے خوف سا سب پر تمام رات
روشن جو چار سو یہ دعاؤں کے تھے چراغ
عثمان، سجدہ ریز رہا سر تمام رات

میں بھی فانی ہوں تو بھی فانی ہے
بے نشانی سی بے نشانی ہے

دوست کوئی پرانا مل جائے
مجھ کو تازہ غزل سنانی ہے
عقل روتی ہے عمر بھر اس پر
بات جس نے بھی دل کی مانی ہے
ایک جادو ہے تیری قربت کا
اور کچھ شام بھی سہانی ہے
اس کی تجدید پھر سے کرنی ہے
جو کہانی بہت پرانی ہے
میرے بیٹے کے روپ میں عثمان
ہوبہو میری ہی جوانی ہے

جاگا ہوا تھا رات یا سویا ہوا تھا میں
میرا ہوا تھا کوئی کسی کا ہوا تھا میں
ہم دونوں کی پرچھائیاں یکجا ہوئی تھیں اور
وہ بھی ڈرا ڈرا سا تھا، سہما ہوا تھا میں
اُٹھنے لگے تھے سارے ہی پردے حجاب کے
بدلا ہوا تھا وہ بھی اور بدلا ہوا تھا میں
ہے یاد مجھ کو سخت وہ سردی کی رات تھی
لیکن کسی کے قرب سے دہکا ہوا تھا میں
رکھا کسی کی بانہوں نے مجھ کو سمیٹ کر
پہلے تو اپنی ذات میں بکھرا ہوا تھا میں
ان لذتوں سے پہلے تو میں آشنا نہ تھا
کیا کیا نہ اپنی موج میں دریا ہوا تھا میں
حُسن و جمال عشق پر کھلتا چلا گیا
سمٹا تھا وہ بھی مجھ میں اور بہکا ہوا تھا میں
عثمان کیسے چھپتے وہ لمحے وصال کے
اس کے بدن کی خوشبو سے مہکا ہوا تھا میں

جو اک نظر اُٹھا کے کبھی دیکھتا نہیں
اس کا خیال مجھ کو کبھی چھوڑتا نہیں
تنہائیوں کو میری جو مہکار دے گیا
محفل میں سب کے سامنے پہچانتا نہیں
بس وہ ہی بات اس سے منانی ہے ایک دن
رُسوائیوں کے ڈر سے جو وہ مانتا نہیں
یہ آزما کے دیکھ لیا ہر رقیب نے
میرے سوا کسی کو وہ گردانتا نہیں
اُلجھا ہوں لاکھ دنیا کے میں کاروبار میں
بھولے سے بھی اسے میں کبھی بھولتا نہیں
رہتا ہوں اُس کے عشق کی دولت سے مستفاد
زر کی چمک کے پیچھے کبھی دوڑتا نہیں
اس کے حسین رُوپ کو جس میں سما سکوں
ایسا کوئی بھی شعر تو اب تک لکھا نہیں
منزل پہ آ کے کھو گئے اک دوسرے میں ہم
اب اس سے آگے کوئی بھی تو راستہ نہیں
اک دوسرے کی آنکھوں میں کھوئے ہیں اس طرح
ہم دونوں ہیں خموش کوئی بولتا نہیں

آفتاب خان/لاہور

میں ستارے تلاش کرتا تھا   آ گیا آفتاب مٹھی میں

آفتاب خان نے 15 ستمبر 1979ء کو پشاور میں جنم لیا۔ مگر تین سال کی عمر میں اُسے والدین کے ہمراہ لاہور آنا پڑا اور تب سے اب تک یہیں پر ہے۔ تعلیمی مدارج لاہور ہی میں طے ہوئے اور پھر ادبی سفر کا آغاز بھی لاہور کی سرزمین سے ہوا۔ شاعری میں اُس کے استاذ علامہ بشیر رزمی ہیں جن کے سامنے آفتاب خان نے 1997ء میں زانوئے تلمذ کیا اور اس وقت اُس کا شمار عہدِ حاضر کے چند اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ آفتاب خان کا پہلا شعری مجموعہ ''آفتاب مٹھی میں'' زیرِ طبع ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس کا کلام پچاس سے زائد ادبی رسائل کے تقریباً ہر شمارے میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ (ارژنگ)

خون میرا گرا ہتھیلی پر
لوگ سمجھے حنا ہتھیلی پر
شام اچھی گزر ہی جائے گی
رکھ ہتھیلی ذرا ہتھیلی پر
بارشوں کے لیے دُعا مانگی
آسماں گر پڑا ہتھیلی پر
آرزو کی چتا جلا کر آج
راکھ میں لے چلا ہتھیلی پر
چل پڑا ہوں میں خود اُٹھائے ہوئے
اپنی ہر اک خطا ہتھیلی پر
میں نے تو آفتاب مانگا تھا
اشک وہ دھر گیا ہتھیلی پر

وہ اگر میری آرزو نہ کرے
دل کسی شے کی جستجو نہ کرے
شام تو شام ہی نہیں لگتی
وہ اگر مجھ سے گفتگو نہ کرے
میرا لہجہ ہے آج کا لہجہ
کوئی مجھ سے کبھو کبھو نہ کرے
وہ خوشی سے نمازِ عشق پڑھے
میرے خوں سے مگر وضو نہ کرے

وہ دکھاتا ہے جس طرح تیور
اس طرح جنگ، جنگجو نہ کرے
اس سے کہہ دو کہ آفتاب ہوں میں
وہ دیا میرے روبرو نہ کرے

اپنے دامن میں کسی روز چھپا کر لے جا
میں اگر رُوٹھ گیا ہوں تو منا کر لے جا
سب یہ کہتے ہیں چرایا ہے ترا دل میں نے
ہے اگر کوئی نشانی تو بتا کر لے جا
تجھ کو اس راہِ محبت میں ملیں گے کانٹے
جتنے بھی پھول ہیں جوڑے میں سجا کر لے جا
دل بہلتا ہے ترا توڑ کے شیشے کا بدن
میں بھی نازک سا کھلونا ہوں اُٹھا کر لے جا
آفتاب آگ میں جلتا ہے فلک پر تنہا
تو فرشتوں کی نگاہوں سے بچا کر لے جا

نزدیک وہ نہیں تو طبیعت اُداس ہے
اب تک لہو میں اُس کے لبوں کی مٹھاس ہے
پازیب بج رہی ہے تمنا کے پاؤں کی
یا پھر ہوا کا شور مرے آس پاس ہے

تصویر سے نکل کے وہ پہلو میں آ گیا
کمرے میں گیسوؤں کے بکھرنے کی باس ہے
ہاتھوں پہ رہ گئے ہیں فقط ریت کے نشاں
لیکن مجھے یقین تھا صحرا میں گھاس ہے
جس نے بھی کی نگاہ پریشان ہو گیا
شاید مرے وجود پہ نقلی لباس ہے

ہم نے خود راہ کو دشوار بنا رکھا ہے
گردشِ وقت نے فنکار بنا رکھا ہے
دل جلانے کے سوا جس کا ہنر کوئی نہیں
ہائے کس شخص کو دلدار بنا رکھا ہے
دل کی بستی میں غریبوں کو ذرا رہنے دو
کیوں اسے شاہ کا دربار بنا رکھا ہے
ہم سے جگنو بھی ستاروں کی طرح ملتے ہیں
ہم نے گھر دشت کے اُس پار بنا رکھا ہے
اُس کے لہجے سے محبت کا بدن کٹنے لگا
اُس نے ہر بات کو تکرار بنا رکھا ہے
اپنے کوچے کو عقیدت کا بنا دو محور
کیوں اسے مصر کا بازار بنا رکھا ہے

مبشر بلوچ / بھکر

میرے احباب کتنے پریشان ہیں میرے دشمن میں تیری حفاظت میں ہوں

عصر حاضر کے جن نوجوان شعرانے مجھے متاثر کیا ہے۔ ان میں ایک نام مبشر بلوچ کا بھی ہے۔ مبشر بلوچ نے نوجوان ہونے کے باوجود نہایت اعتماد سے سفر کا آغاز کیا ہے اور بہت جلد اُردو کے ان چند جدید شعرا کی صف میں شامل ہو جائے گا جو اُردو شاعری کی نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ ضلع بھکر سے تعلق ہونے کی وجہ سے مبشر کی شاعری میں صحرا جیسی وسعت اور کھلتے ہوئے سرسوں جیسی تازہ کاری موجود ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ عنقریب مبشر کی غزل ایک توانا اور دورِ حاضر کی نمائندہ غزل کے طور پر اپنا مقام حاصل کرے گی۔ (انجم سلیمی)

سب سے صرفِ نظر کیا میں نے
اپنے اندر سفر کیا میں نے
دل میں محفوظ تھیں تری یادیں
ہائے دل کو کدھر کیا میں نے
زیست ہاری تھی، دل نہ ہارا تھا
عشق بارِ دگر کیا میں نے
خود یہ حیرت ہے، تیرے ہوتے ہوئے
آج خود کو بسر کیا میں نے
تیرے غم نے بنا دیا شاعر
تیرے غم کو ہنر کیا میں نے

عشق میں یوں تو انتہا کروں گا
بچ گیا تو خدا خدا کروں گا
جو محبت سکھا کے جا رہے ہو
وہ محبت کہاں کیا کروں گا
خواہشیں پر نکالنے لگی ہیں
ان پرندوں کو اب رہا کروں گا
میں ترا انتظار کر رہا ہوں
تو اگر آ گیا تو کیا کروں گا

یہ محبت نہیں مرے بس کی
میں کوئی کام دوسرا کروں گا

سامنا جب مرا ہوا مجھ سے
چہرہ دیکھا نہیں گیا مجھ سے
میں اسے کیسے روک سکتا تھا
ایک آنسو نہیں رکا مجھ سے
میں نے خود ترک کر دیا خود کو
تم نے تو کچھ نہیں کہا مجھ سے
ایک تو ہی نہیں ملا ورنہ
غم ہمیشہ گلے ملا مجھ سے
اس لیے عہد میں نہیں کرتا
عہد ہوتا نہیں وفا مجھ سے

بس گھڑی دو گھڑی کی خوشی ہے میاں
یہ محبت نہیں خودکشی ہے میاں
میں تو محتاط اظہار کرتا رہا
تم سمجھتے رہے، شاعری ہے میاں

یہ تعلق ہے یا بوجھ ہے، کیا کہوں
یہ محبت ہے یا نوکری ہے میاں
مجھ کو چھونا نہیں، دور سے دیکھنا
میری مٹی بہت بھربھری ہے میاں
چوم لو اس کو تاکہ مہکنے لگے
پھول ہے، پھول بھی کاغذی ہے میاں
میں نے تنہا کیا خود کو، اچھا کیا
اس جہاں سے مری کب بنی ہے میاں

سب کو تشویش تھی، کس مصیبت میں ہوں
مجھ کو معلوم تھا میں محبت میں ہوں
قیس نے دشت سونپا ہوا ہے مجھے
آج کل میں وہیں کارِ وحشت میں ہوں
چار دیواری جائے اماں تو نہیں
گھر میں بیٹھا ہوا بھی میں ہجرت میں ہوں
میں ترا وہم، تیرا گماں تو نہیں
تو بتا، واقعی میں حقیقت میں ہوں؟
میرے احباب کتنے پریشان ہیں
میرے دشمن میں تیری حفاظت میں ہوں
ٹھیک سے میزبانی نہیں ہو رہی
اپنا مہماں ہوں، اپنی مدارت میں ہوں

بدر سیماب / کویت

کیسے ٹھہرے گی یہ صدیوں کی روانی آخر   چلنا پڑتا ہے جہاں وقت کا دھارا جائے

کویت میں مقیم بدر سیماب ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ نوجوان ہیں ذہن زرخیز، نئے خیالات اور نئے مضامین ان کی شاعری میں جھلکتے ہیں۔ غزل اور نظم دونوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ بدلتے ہوئے رجحانات اور دورِ جدید کے تقاضوں کو پورے کرتے ہوئے غزل کے روایتی اسلوب کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ جو غزل کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ دیارِ غیر میں رہتے ہوئے پردیس کی مجبوریوں اور گھر سے دور وطن اور اہلِ خانہ سے دوری سے لے کر معاشی مجبوریوں کا ذکر بھی ان کی شاعری میں جھلکتا ہے۔ بحر خفیف ہو یا بحر ثقیل ان کی مشقِ سخن میں آڑے نہیں آتی۔ آنے والے دور میں ادبی میدان میں نمایاں جگہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ (ناز اوکاڑوی)

انھیں پھر پھول کہہ لو یا شرارے بانٹ آیا ہوں
مرے دامن میں جتنے تھے ستارے بانٹ آیا ہوں
مجھے کچھ لوگ کہتے تھے حساب اُن کا چکا دوں میں
گئے موسم کے جتنے تھے شمارے بانٹ آیا ہوں
پھر اُس کے بعد اے صاحب! مجھے کچھ دیکھنا کب تھا
نظر بھی دان کر دی ہے نظارے بانٹ آیا ہوں
مجھے معلوم جو ہوتا تو میں منصف نہیں بنتا
زمیں کیا بانٹ دی میں نے وہ پیارے بانٹ آیا ہوں
بھنور کی ہو گئی عادت، عجب تھا حوصلہ مرا
کہ دریا پاس رکھا ہے کنارے بانٹ آیا ہوں
ضرورت تھی انھیں سیماب مجھ سے بھی کہیں بڑھ کر
عدو کے قافلے میں سب سہارے بانٹ آیا ہوں

غم کی تصویر بنے بیٹھے ہیں
کیسے دل گیر بنے بیٹھے ہیں
تم تو خوابوں کو لیے پھرتے ہو
ہم تو تعبیر بنے بیٹھے ہیں
جو میرے لوگ سمجھتے ہی نہیں
ہم وہ تحریر بنے بیٹھے ہیں
اب جو مرضی ہو کرو تم صاحب
تیری جاگیر بنے بیٹھے ہیں
کوئی بھولے سے نہیں کرتا جو
ہم وہ تقصیر بنے بیٹھے ہیں

طمانچہ

دولت کی اس منڈی میں
غرض کی اندھی نگری میں
ہر چیز ہی بکتی آئی ہے
ہر شخص کا سودا ہوتا ہے
ہر جذبہ رُسوا ہوتا ہے
سکوں کی جھنکار میں دب کر
عزت، شہرت، غیرت سب کچھ
اپنی شکلیں کھودیتے ہیں
اپنے آپ کو رو دیتے ہیں
غرضوں کے بازار میں لوگو!
لے کر چیز وہ آیا ہوں
آج سے پہلے جسے کسی نے
بیچا اور نہ خریدا ہوگا
سب کو شاید فائدہ ہوگا
اچھے بھاؤ بیچوں بھی تو
مجھ کو تو بس گھاٹا ہے
(یہ کس نے وقت کے خنجر سے
آس کی ڈور کو کاٹا ہے)
خود کو بہت تھا روکا میں نے
لیکن پھر بھی آ ہی گیا
غرض کے در پہ سر کو جھکا کر
اپنے آپ سے آنکھ چرا کر
جیون رُت کے سارے بچے
سپنے بیچنے آیا ہوں میں
مجھ سے میرے بچے لے لو......
مجھ کو لیکن روٹی دے دو
غرضوں کے بازار میں لوگو!
بچے بیچنے آیا ہوں میں

پاؤں میں کتنے چھالے پھوٹے
صحرا میں جب ساتھی چھوٹے
پھول نہیں وہ خواب تھے جاناں
تیز ہوا میں ڈال سے ٹوٹے
صبح نے مجھ کو خواب دکھائے
شام نے میرے سپنے لوٹے
تم سے تو بس غیر نہ بولے
ہم سے اپنے پیارے رُوٹھے
گاؤں کے باسی پیار نبھائیں
شہر کے سارے بندھن جھوٹے
موسم کے جب ظلم ہے تو
صدیوں سے کچھ لمحے ٹوٹے

رانا سردار پرویز/ساہیوال

عرش والے بھی آ کے سجدہ کریں　　　　ایسی بھی ہے زمیں زمانے میں

گولڈ میڈلسٹ شاعر ادیب سینئر صحافی رانا سردار پرویز۔ پاک و ہند کے معروف فلمی شاعر تنویر نقوی کے مایہ ناز شاگردوں میں سے ہیں۔ آپ اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ آپ 1974ء سے شاعری کر رہے ہیں ہفت روزہ دستار اخبار کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ ساہیوال سے 1991ء سے باقاعدگی کے ساتھ اپنا دستار اخبار شائع کر رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ اب تک 25 شامیں منائی گئی ہیں اور اب تک آپ تقریباً 26-25 کل پاکستان مشاعرے پڑھ چکے ہیں۔ پاکستان کے بڑے بڑے شاعروں قتیل شفائی، افتخار عارف، طفیل ہوشیار پوری، احمد ندیم قاسمی، ظفر اقبال، خالد احمد، اعتبار ساجد وغیرہ سب کے ساتھ آپ ادبی محفلوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ اسلام آباد، لاہور، فیصل آباد، اوکاڑہ، قبولہ، ہڑپہ، پاکپتن، چیچہ وطنی، ساہیوال مختلف شہروں میں آپ مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ چنتے زخم، اُردو، بکھری سوچ، پنجابی عنقریب ان کی شاعری کے مجموعے منظر عام پر آ رہے ہیں۔ بقول آپ کے اردو ہماری قومی زبان ہے اور پنجابی ہماری مادری زبان ہے۔ ساحر لدھیانوی، فیض احمد فیض، علامہ اقبال، مرزا غالب اور استاد محترمی تنویر نقوی آپ کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ (آفتاب کاوش)

اُلفت تو کسی دل میں مری جان نہیں ہے
اس دور میں انسان کی پہچان نہیں ہے
تو وہ بھی نہیں وہ تیری رنگت بھی نہیں ہے
ہونٹوں پہ تیرے پہلی سی مسکان نہیں ہے
کافر نہ رہے ایک بھی اس سارے جہاں میں
اب اس کے سوا کوئی بھی ارمان نہیں ہے
بے دینوں کو جو دین سے کرتا نہیں آگاہ
اپنی تو نگاہوں میں مسلمان نہیں ہے
چاہت میں اگر اس کی میں یہ جاں بھی گنوا دوں
اس پر میرا پھر بھی کوئی احسان نہیں ہے
یہ دیس میرا دیس ہے مٹ جاؤں گا اس پر
اس کو میں بھلا دوں یہ میری شان نہیں ہے
ایک در پے کا ہم خود ہی گلا کاٹ رہے ہیں
ہم سا تو جہاں میں کوئی نادان نہیں ہے
لبریز ہے پرویز کا دل سوز وفا سے
وہ جانتا ہے اتنا تو انجان نہیں ہے

چاند کی سمت کوئی کیوں دیکھے
چاند سی ہے جبیں زمانے میں
میرے محبوب سا نہیں کوئی
لاؤ گر ہے کہیں زمانے میں
عرش والے بھی آ کے سجدہ کریں
ایسی بھی ہے زمیں زمانے میں
نہ ہوا ان سا اور نہ ہوگا
وہ ہیں ایسے امیں زمانے میں
پہلے پرویز سے محبت کی
پھر ہوئے دل نشیں زمانے میں

جب کہ ان کو میں لا دوا سمجھوں
کون کہتا ہے میں نہیں ان کا
میں تو اپنا انہیں خدا سمجھوں
ان کے قصے جو چھیڑے دل نے میرے
آج اپنی ہی میں قضا سمجھوں
سنگدل اس قدر ہوں اے پرویز
خود پہ کرنا ستم روا سمجھوں

بے وفا کو میں باوفا سمجھوں
زندگی بھر کا آسرا سمجھوں
جب تک غم تیرے سلامت ہیں
کیوں تجھے خود سے میں جدا سمجھوں
چھن گئی ہر خوشی مگر پھر بھی
تو ہی کہہ دے تجھے میں کیا سمجھوں
دل کے زخموں کی ہو دوا کیسے

ان کو دیکھا حسیں زمانے میں
اور اُن سا نہیں اس زمانے میں

برطانیہ (نوٹنگھم) میں مقیم
معروف شاعرہ، افسانہ نویس اور ناول نگار
سعدیہ سیٹھی کا
تازہ شعری مجموعہ
تنہائیاں
مکمل اہتمام کے ساتھ
شائع ہو گیا ہے

ناشر: نستعلیق مطبوعات
فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

نازبٹ/لاہور

زہے قسمت کہ سایہ دار بھی ہے باثمر بھی
مرے سر پر محبت کا شجر کتنا حسیں ہے

نازبٹ نظم وغزل کی بہت خوبصورت شاعرہ ہیں۔ انہوں نے بہت کم عرصہ میں ادبی دنیا میں اپنا نام بنایا ہے۔ نازبٹ کا کلام پاکستان کے موقر ادبی جریدوں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات نہ صرف عورت ذات کے اندرون کو بیان کرتے ہیں بلکہ وہ زندگی سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں جب ان کا شمار ہمارے ملک کی نامور شاعرات میں ہوگا۔

چمن سا دشت تا حدِ نظر کتنا حسیں ہے
تو میرا ہم قدم ہے تو سفر کتنا حسیں ہے
مری جانب لپکتی منزلوں سے پوچھ لینا
کسی کے ساتھ چلنے کا ہنر کتنا حسیں ہے
وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے میرا ہو کر
دعائے نیم شب کا یہ اثر کتنا حسیں ہے
زہے قسمت کہ سایہ دار بھی ہے باثمر بھی
مرے سر پر محبت کا شجر کتنا حسیں ہے
عجب خواب آشنا آنکھیں ہوئی ہیں وصل کی شب
کھلی ہے آنکھ تو رنگِ سحر کتنا حسیں ہے
میں ہنستی کھیلتی ہوں جس کے خواب نارسا میں
مرا احساسِ حسرت ہے مگر کتنا حسیں ہے
نہیں ہے نازؔ کم جنت سے میرا آشیانہ
محبت سے مزین میرا گھر کتنا حسیں ہے

پہلے دکھ درد کئی دل میں سنبھالے میں نے
پھر کیا خود کو ترے غم کے حوالے میں نے
کیوں کھلے تجھ پہ سفر میں تھی اذیت کیسی
کب دکھائے ہیں تجھے روح کے چھالے میں نے
تو نے ہر گام جو بخشے ہیں اندھیرے مجھ کو
ان اندھیروں میں ترے خواب اُجالے میں نے
تیری تصویر مرے پاس تھی یعنی تو تھا
دن ترے ہجر کے اس خواب میں ٹالے میں نے
تیرے غم سے کیا دنیا کے غموں کا چارہ
یعنی اک خار سے سب خار نکالے میں نے
شہر والوں نے انہیں ابرِ کرم سمجھا نازؔ
اپنے آنسو جو ہواؤں میں اُچھالے میں نے

احساس

اُس لمس کا کوئی نام تو ہو جو تجھ کو سوچ کے جگتا ہے
جو تیرے ذکر کے آتے ہی رگ رگ میں دوڑنے لگتا ہے
کیوں تیرے نام کو سنتے ہی مری سانس مہکنے لگتی ہے
احساس نشے میں ہوتا ہے ہر فکر بہکنے لگتی ہے
اک نادیدہ احساس مری پوروں میں کھلنے لگتا ہے
اک بند دریچہ حسرت کا خوابوں میں کھلنے لگتا ہے
جب چاند نکل کر بادل سے آنکھوں میں سپنا بوتا ہے
اک خواہش کی تنہائی سے بیدار جنوں جب ہوتا ہے
جب دشتِ طلب میں پیاس مری آنکھوں کو تکنے لگتی ہے
جب آس اُمید کی دنیا میں اک شام سی ڈھلنے لگتی ہے
جس وقت غموں کی وحشت کا اک سایہ مجھ پر جھکتا ہے
اُس وقت ترا احساس مرے پہلو میں آ کر رُکتا ہے
اور اُس احساس کے چھوتے ہی میں تابندہ ہو جاتی ہوں
مری سانسیں چلنے لگتی ہیں پھر سے زندہ ہو جاتی ہوں

الاماں......الاماں!!

صبح سے شام تک
سلسلہ زیست کا
کس قدر ہے کٹھن...... کس قدر بے اماں!
لمحہ لمحہ سسکتی ہوئی زندگی......
ہر قدم پر بلکتی ہوئی زندگی......
خواہشوں کی اسیری پہ نوحہ کناں
ہر گھڑی جسم و جاں......!
روح گھائل...... خراشوں کے دل پر نشاں
روزِ اول سے جاری و ساری یہاں
وحشتوں کا سماں......!
کوئی پل بھی اذیت سے خالی نہیں
کون سی آنکھ ہے جو سوالی نہیں......!
کوئی وارث نہیں...... کوئی والی نہیں
گلشنِ خواب کا کوئی مالی نہیں
ختم ہوتا نہیں شورِ آہ و فغاں
ہے ازل سے ابد تک یہی داستاں
الاماں......الاماں

رقیہ غزل/لاہور

اپنے ہی جی نے چاہا تو بے مول بک گئے   ویسے یہ جنسِ دل کبھی ارزاں نہ ہو سکا

رقیہ غزل نوجوان اُبھرتی ہوئی شاعرہ اور کالم نویس ہیں۔ وہ "تنقیدی شعور" کی ایڈیٹر ہفت روزہ "صدائے انقلاب" کی ایڈیٹر اور "پاکستان پوسٹ" کی کالم نگار ہیں۔ شہرہ آفاق شعراء کے کلام پر مبنی دو انتخاب مرتب کر چکی ہیں۔ معروف تعلیمی اکیڈمی میں بطور پرنسپل خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ (ارژنگ)

جس کو چاہا تھا وہ ملا ہی نہیں
اس سے بڑھ کر کوئی سزا ہی نہیں
جان کر حالتِ دلِ نازک
چپ تھا جیسے کہ کچھ سنا ہی نہیں
کیسا آیا زوال ہستی پر
اپنا کوئی یہاں رہا ہی نہیں
نام جس کے یہ زندگی کر دیں
ایسا کوئی ابھی ملا ہی نہیں
خود پہ شرمندہ ہے غزلؔ ہم دم
آپ سے تو کوئی گلہ ہی نہیں

میری بربادیوں کا ذکر جہاں ہوتا ہے
ہاں ترے نام کا چرچا بھی وہاں ہوتا ہے
ذہن و دل میں غمِ دنیا نے بسیرا ڈالا
اب محبت کا بیوپار کہاں ہوتا ہے
بے وفا اس کو کسی طور نہیں کہہ سکتی
وہ مرے ساتھ ہے ہر دم یہ گماں ہوتا ہے
وصل حاصل ہے جسے ہجر بھلا کیا جانے
جان پائے ہے وہی جس کا زیاں ہوتا ہے
درد جو دیتے ہیں مجھ کو وہی کہتے ہیں مجھے
تیری غزلوں میں غزلؔ کتنا فغاں ہوتا ہے
تسکین کا کہیں سے بھی ساماں نہ ہو سکا

اس درد کا کسی سے بھی درماں نہ ہو سکا
کہنے کو ہر قدم پہ مرے ساتھ ساتھ تھا
لیکن سفرِ حیات کا آساں نہ ہو سکا
وہ گل سا کھل رہا تھا کہ دل چور چور تھا
چہرے سے اس کے کچھ بھی نمایاں نہ ہو سکا
یوں کشمکش کے بیچ تو گزری تمام عمر
لیکن کوئی بھی غم غمِ جاناں نہ ہو سکا
اب اس کو خونِ دل کہیں یا اور کچھ کہیں
آنکھوں میں اشک بن کے جو لرزاں نہ ہو سکا
اپنے ہی جی نے چاہا تو بے مول بک گئے
ویسے یہ جنسِ دل کبھی ارزاں نہ ہو سکا
ویسے تو اس کے نام سے منسوب ہے غزلؔ
لیکن مری غزل کا وہ عنواں نہ ہو سکا

ایک پتھر سے دل لگا بیٹھے
سادگی دیکھ دھوکہ کھا بیٹھے
یاد رہ رہ کہ آتی ہے وہ شام
پاس وہ جب ہمارے آ بیٹھے
جب سے بچھڑے ہو یوں لگے ہم کو
کل اثاثہ تھا جو لٹا بیٹھے
پھر بھلا کیوں کریں یقیں اس پر
جس کو اک بار آزما بیٹھے

ہم نے کیا کچھ کیا نہ تیرے لیے
سارے احسان تم بھلا بیٹھے
عشق میں نامور وہی دیکھے
اپنی ہستی کو جو مٹا بیٹھے
آئینہ دیکھ کر خیال آیا
ہم جوانی غزلؔ لٹا بیٹھے

نہ رکھ حیات ابھی ایسے قید کر کے مجھے
کئی دکھانے ہیں جوہر ابھی ہنر کے مجھے
بھٹک رہی ہوں میں دشتِ فراق میں کب سے
ملا دے قافلے کوئی مرے نگر کے مجھ
یہ آپ سے ہو ملاقات آخری شاید
سو دیکھ لیجیے اس بار آنکھ بھر کے مجھے
میں منتظر ہوں تری آج بھی وہاں ہم دم
جہاں تو چھوڑ گیا تھا اُداس کر کے مجھے
یقیں نہ آیا اسے جب مری محبت پر
یقیں دلانا پڑا جان سے گزر کے مجھے
ہزار شکوے غزل کو ہیں زندگی تجھ سے
ملا کیا ہے تجھے برباد ایسے کر کے مجھے

روبینہ جلیل بینا / اوکاڑہ

کیسے ڈھونڈوں گی ان کی تعبیریں　　　　کچھ نہیں سوچا خواب بنتے ہوئے

شعر گوئی دل کے پھپھولے پھوڑنے کا کام ہے جسے اپنی عمر کے حساب سے روبینہ نے انتہائی مشاقگی سے کیا ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے ڈھلتے ہوئے آنسوؤں کو مٹی میں نہیں ملنے دیا بلکہ "سپنے بنتی آنکھیں" کے نام سے ایک مالا میں پرو دیا ہے۔ جس سے درد دل رکھنے والے تسبیح کا کام بھی لے سکتے ہیں۔ کیونکہ اہل دل کے پاس دکھوں کو شمار کرنے کے علاوہ کام ہی کیا ہوتا ہے۔ روبینہ نے، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنے دکھوں کی طرح اپنی شاعری کی ہوا بھی اپنے والد احمد جلیل کو نہیں لگنے دی۔ یقیناً ان کی شاعری اس کے گھر والوں کی طرح اُس کے حلقہ احباب اور قارئین کو چونکانے کے لیے کافی ہوگی۔ (مسعود احمد)

ہو گئے چکنا چور خواب مرے
خواب سب بن گئے سراب میرے
کس طرح دور ہو گئے مجھ سے
سایا بن کر تھے ہم رکاب مرے
میرا ہر زائچہ ہی جھوٹا تھا
سارے نکلے غلط حساب مرے
میرے سولہ سنگھار روٹھے ہیں
سارے مرجھا گئے گلاب مرے
نارسا ٹھہری ہر دعا میری
سجدے ٹھہرے نہ باریاب مرے
بیناؔ بدلی نہیں ابھی قسمت
اب بھی حالات ہیں خراب مرے

کر رہے ہیں حساب زخموں کا
دیدنی ہے شباب زخموں کا
میں نے پوچھا کہاں پہ اُگتے ہو
''کشت دل'' تھا جواب زخموں کا
عشق کا امتحان پھر دینا
پہلے پڑھ لو نصاب زخموں کا
درد دل میں ترے جگانا ہے
کر کے کچھ انتخاب زخموں کا
تیری چارہ گری مسلم ہے
کچھ مداوا جناب زخموں کا
موسم گل میں کاش دیکھتے تم
دیدنی تھا شباب زخموں کا
پھر کوئی یاد آ گیا بیناؔ
کھل گیا پھر سے باب زخموں کا

تجھ کو اپنانے کا دل میرا تمنائی کیوں ہے
میرے سینے میں کوئی چیز پرائی کیوں ہے
اس سے بہتر تھا کہ آئینہ بدل لیتے تم
تم نے تصویر مری دل سے مٹائی کیوں ہے
اپنے لوگوں میں وہ بیگانہ بنا رہتا ہے
اور غیروں میں بہت اُس کی شناسائی کیوں ہے
کتنی مشکل سے زمانوں میں تجھے ڈھونڈا ہے
درمیاں پھر یہ ترے میرے جدائی کیوں ہے
اپنی چاہت جو زمانے سے الگ ہے بیناؔ
جانتی ہوں کہ یہ حیران خدائی کیوں ہے
چشم بینا کا تمہیں دعویٰ بہت تھا بیناؔ
پھر یہ چلتے ہوئے ٹھوکر بھلا کھائی کیوں ہے

ترے بن ہے سونا یہ دل آشیانہ
کہاں کھو گئے ہو ہمیں بھی بتانا
بہاروں کے موسم ہیں منسوب تجھ سے
جدائی تری ہے خزاں کا زمانہ
تری آرزو میں یہ حالت ہوئی ہے
حقیقت سے میں بن گئی ہوں فسانہ
سنبھالے سے دولت سنبھلتی نہیں ہے
عجب تو نے بخشا ہے غم کا خزانہ
کبھی بھول کر بھی وہ آئے نہ بیناؔ
کسی کام آیا نہ گھر کا سجانا

تمہیں بھلا دیں یہ دل کس طرح گوارا کرے
تمہارے پیار میں کھو جائیں من ہمارا کرے
ترے بغیر فضائیں اُداس ہیں جاناں
ترے بغیر کنارا بھی اب کنارا کرے
قدم قدم پہ مصائب کے ہیں پہاڑ کھڑے
ترے بغیر تو منزل بھی نہ اشارا کرے
پکارتا ہے اُسے میرے دل کا سونا نگر
یہ بس بھی سکتا ہے آنے کا گر وہ چارہ کرے
نہیں ہے کوئی بھی ملنے کی بیناؔ اب صورت
مگر یہ دل ہے کہ پھر بھی اسے پکارا کرے

متفرق نظمیں

آ گہی کا جال

مرے اپنے حروف کا جال
مری روح پر تنگ ہوتا جا رہا ہے
اور اب تو مری روح کی ہڈیاں
چیخ رہی ہیں
اور سراب آ گہی کے سامنے
سر پٹخ رہی ہیں
یہ "سکوت" کے حروف
جنھوں نے میری سماعتوں سے
شور کا لہو نچوڑ لیا ہے
یہ "روشنی" کے حروف

کہ جنھوں نے مری آنکھ کے
کانچ کے دیوں میں رکھا ہوا
تیل پی لیا ہے
یہ "ذائقے" کے حروف
جنھوں نے مری زبان کو
لبوں کے درمیان مار کر
دفن کر دیا ہے
اور یہ اضطراب
جس نے میرے پیر کی رگوں کی جگہ
سفر کی خواہشوں سے بنی ستلیاں کھینچ دی ہیں
اور یہ آ گہی
جس نے مری روح کی بچی کھچی
ہڈیاں بھی سمیٹ دی ہیں

ڈاکٹر ثروت زہرا/ شارجہ

سفر میں سوگ کا منظر

کراہت کی منڈی میں
سرسبز شاخوں، گل لالہ چہروں کے
بازار لگنے لگے ہیں
زمیں اپنے دریا کنارے پڑی
ادھ موئی پیاس کی پڑیاں پالتی ہے
زندگی! تیرے خوانچہ فروشوں کو
زخموں کے اس تول میں دام وافر ملا ہے

نصیبے کے ہر زاویے میں
نیو ورلڈ آرڈر کی لو
سایہ کرتی رہی ہے
سڑک پر جمے خون کے داغ دھبے
مرے راہگیروں کا زاد سفر ہیں
بڑے چوک پر
قصہ خوانوں کی آواز میں
کل کی خبروں کی دہشت گھلی ہے
کباڑی کے ٹین اور ٹکڑوں تلے
ادھ کھلی انگلیوں میں گریبان
اور آدھی سگریٹ کا ٹوٹا دبا ہے
بھکارن کے کاسے میں
خاموشیوں سے بلکتے ہوئے
باسی سکے دھرے ہیں
کڑکتی کڑاہی میں
اگلے دنوں کی بشارت تلی جا رہی ہے
رواں نالیوں میں
جواں
شبنمی
خواب آلودہ آنکھیں
بہی جا رہی ہیں
گلی کے کنارے
جواں، آوارہ آوازے اور سیٹیاں
مجسم ہونے لگے ہیں
زمانے کے بازار میں آج پھر
سوگ کی بولیاں چڑھ رہی ہیں

ڈاکٹر ثروت زہرا/ شارجہ

تم کہیں بھی نہیں گئے ہو

تم کہیں بھی نہیں گئے ہو، یہیں تو ہو...
میرے کمرے میں پھیلی
وسعتِ صحرا کی تنہائی میں...
حسرت زدہ حصارِ خاموشی میں...
انہیں پردوں کے پیچھے چھپ کر
مجھے نظمیں لکھتی دیکھ کر، مسکراتے... سر کو ہلاتے...
کبھی کبھی تم خفا بھی تو ہوتے ہو گے
میرے دیر تک کتابیں پڑھنے سے
بار بار بتی جلانے سے....
تم یہیں کہیں ہو...
کہرے جمی کھڑکیوں پر
دھیرے سے میرا نام لکھتے، میرا دھیان کھینچتے، بانٹتے، موڑتے

متفرق نظمیں

جب میں سو جاؤں
برف میں دبے پتوں کو اُٹھاتے
شرارت سے میری ہتھیلی پر رکھتے، قہقہے لگا کر ہنستے
یا پھر میرے پاؤں میں مہندی رچاتے
میری آنکھوں میں جھلکتے تاروں کو میٹھی لوری سناتے
تم یہیں کہیں ہو....
ہر صبح میں تمہیں کشتی میں سوار ہو کر
جھیل کے پار جاتے دیکھتی ہوں
اور پھر آنے والی شب کا انتظار کرتی ہوں
جب تم پیچھے سے آؤ گے، پیار سے ڈانٹو گے....
کیوں اس کمرے کو صحرا بنا رکھا ہے
اک دن یہی نیلا کمبل اوڑھے
میں ریت میں دفن ہو جاؤں گی....
اور پھر سارے دن کی جمع ریت اُٹھا کر
میرے کمرے سے باہر پھینکو گے
اسے صحرا بننے سے روکو گے....
تم کہیں بھی نہیں گئے ہو.... یہیں تو ہو....

تن دیپ تمنا/کینیڈا

کل کب آئے گا

کیا آج کل ہے
نہیں تو یہ
کل کب آئے گا؟
کل کچھ ہونے والا ہے؟
کل کچھ ہوگا؟
دیکھا تم
جب کل آئے گا
برسوں بیت گئے
اُس کل نے کہا تھا
کل آؤں گا
آج بھی ہوں منتظر
اُس کل کا
جس کا اُس نے
وعدہ کیا ہے
آنے کا اس نے کہا ہے
تم ہی بتاؤ وناز
وہ کل کب آئے گا

نازاوکاڑوی/لاہور

گردشوں کے غلام

وقت کی گردش میں
آکر
وقت تو رُکتا نہیں
وقت گزر ہی جاتا ہے
اپنی رفتار سے
اپنی منزلیں طے کرنی ہیں اسے
وقت ٹھہر جائے اگر
تو کیسے
طے ہوں گی
مسافتیں اُس کی
گردشیں اپنی جگہ
مسافتیں اپنی جگہ
گردش کا پہیہ رُکتا نہیں
اُلٹا چل سکتا ہے دریا
شجر بھی جھک سکتا ہے
پھلوں کے بوجھ سے
مگر رُکتا نہیں وقت
پہیہ بھی اُلٹا
چلتا نہیں
موسم بھی جیسے
اپنے آپ بدلتا نہیں
ہم گردشوں کے غلام ہیں
آزادی کے متلاشی ہم
بھٹک رہے ہیں
اِدھر اُدھر
اپنی دانست میں
چل رہے ہیں
لیکن
وہیں کھڑے ہیں
ہیں گردشوں کے پہیے ہم
گھوم رہے ہیں
گھوم رہے ہیں

نازاوکاڑوی/لاہور

سنو......!اک مشورہ تو دو

زندگی کے درخت کے نیچے
وقت کی چھاؤں میں
یادوں کی چادر بچھائے
آج رخت سفر باندھے بیٹھا ہوں......!
ادھورے خوابوں کے پتے
ادھوری شام کے آنگن میں

متفرق نظمیں

بکھرے پڑے ہیں......
امیدوں کا چراغ بجھائے
گزرے لمحوں کا حساب کرتے بیٹھا ہوں
مگر
اک الجھن ہے
سانسوں کی گٹھڑی میں
کن یادوں کو باندھوں......؟
تری رفاقت کی چھاؤں......
یا
جدائی کی دھوپ
سنو......!
اک مشورہ تو دو
ادھوری زندگی کو
کن یادوں کے حوالے کروں؟
شہزاد ملک/خیر پور نامے والی

منزل

میں
اک مسافر
مسافت میں تھا
تجھ سے
تیرے شہر میں
چند ساعت پہ تھا
پر
تیرے شہر کی گلیوں میں
یہ کتنا شور ہے
اوہ
یہ کتنے لوگ ہیں
یہ کوئی اور ہے
وہ کوئی اور ہے
ان گلیوں میں
کتنے سر اگے ہوئے ہیں
یہ چل رہے ہیں
یا کہیں پڑ کے ہوئے ہیں
میں چلانا چاہتا ہوں
مجھ میں بہت سا زور ہے
مگر اس قفسوں میں
پہلے ہی کتنا شور ہے
یہاں
کیسے تجھے میں پاؤں گا
پا ہی لیا اگر
تو پھر کہیں گنواؤں گا
بہتر یہی ہے
میرے لیے
اور تیرے لیے
میں گھر کو لوٹ جاؤں گا
احمد عدنان طارق/فیصل آباد

سجنا

سجنا!
میں نے تیرے لیے ہی سجنا ہے
میرے ماتھے پہ تیرا جھومر ہے
اور
ہاتھ میں تیرا کنگنا ہے
سجنا!
میں نے تیرے لیے ہی سجنا ہے
میرے کان کی بالی دیکھو گے
ہونٹوں کی لالی دیکھو گے
تیری آنکھ سے پتھر ہونا ہے
کچھ دیر ردے نے تھمنا ہے
سجنا!
میں نے تیرے لیے ہی سجنا ہے
تو چاند کا ہالہ تکتا ہے
میرے کان کا بالا تکتا ہے
چاند کے داغ نہیں چھپتے
مگر
میری گال پہ میرا تل کالا، تکتے ہو
سجنا!
میں نے تیرے لیے کیا سجنا ہے؟
تو بول پہ میرے مرتا ہے
تو میری پوجا کرتا ہے
نہ زیور میرے سنگ رہیں
نہ گہنے میرے انگ رہیں
ہم اک دوجے کے سنگ رہیں
نہ روپ رہیں نہ رنگ رہیں
سجنا!
تو کتنا بھولا بھالا ہے
تو میرے ماتھے کا جھومر
اور
میرے کان کا بالا ہے
احمد عدنان طارق/فیصل آباد

اکادمی ادبیات، پاکستان کے کمال فن اور قومی ادبی ایوارڈز

کاظم جعفری/لاہور

پاکستانی زبانوں کے فروغ کے لیے سرگرم عمل اکادمی ادبیات، پاکستان کا قیام 1976ء میں ہوا اور اس قومی ادبی ادارے کا صدر دفتر دارلحکومت اسلام آباد میں واقع ہے۔ اس ادارے کے اولیں منصوبہ ساز معروف شاعر احمد فراز تھے جب کہ اس کے موجودہ چیئرمین عبدالحمید ہیں۔ اس ادارہ نے اب تک پاکستانی ادب کے فروغ کے سلسلہ میں مختلف موضوعات پر بہت سی ادبی و تحقیقی اور ترجمہ شدہ کتب شائع کی ہیں۔ ان کتب میں پاکستان اور پاکستان سے باہر رہنے والے بہت سے ادیبوں کا تحقیقی اور تخلیقی کام شامل ہے۔

"پاکستانی ادب کے معمار" کے عنوان سے اکادمی ادبیات، پاکستان نے بہت سے ادیبوں کی شخصیت اور فن کے بارے میں کتب شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ اس ادارہ کے زیر اہتمام "انتخاب پاکستانی ادب، سال بہ سال" کے حوالے سے نثر اور شاعری پر بہت سی کتب بھی شائع ہو چکی ہیں۔ یہ ادارہ پاکستانی ادب کی سال بہ سال کتابیات بھی شائع کرتا ہے۔ علاوہ ازیں ملک بھر کی مختلف زبانوں میں شائع ہونے والی کتب کے حوالے سے ہر سال کمال فن ایوارڈ، قومی ادبی ایوارڈ اور نقد رقم کے انعامات بھی دیتا ہے۔ اس ادارے کے زیر اہتمام گذشتہ برس میں شائع ہونے والی کتابوں کے حوالے سے ایوارڈز کا اعلان کچھ دن قبل ہوا، جن کی تفصیل اس طرح ہے:

اکادمی ادبیات، پاکستان کی طرف سے "کمال فن ایوارڈ 2011ء" کے لیے سندھ کے ممتاز ادیب، دانشور اور افسانہ نگار محمد ابراہیم جویو کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس کا اعلان ایوارڈ کمیٹی کے صدر مسعود اشعر نے اکادمی میں ایوارڈ کمیٹی کے اجلاس کے بعد پریس کانفرنس میں کیا۔ مسعود اشعر نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اکادمی، سیاست سے بالاتر ہو کر کام کر رہی ہے اور کمال فن ایوارڈ کے حوالے سے ہم پر کسی قسم کا دباؤ نہیں تھا۔ واضح رہے کہ "کمال فن ایوارڈ" ملک کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ہے۔

سندھ کے ممتاز ادیب ابراہیم جویو کو مذکورہ ایوارڈ دینے کا فیصلہ کمیٹی نے متفقہ طور پر کیا ہے۔ اس بات کا فیصلہ معتبر اور مستند اہل دانش پر مشتمل ایک پینل نے کیا، جس میں ڈاکٹر سعادت سعید، زاہدہ حنا، فہمیدہ حسین، مسعود اشعر، ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک، ڈاکٹر توصیف تبسم، ڈاکٹر انور زاہدی، م۔ ر شفق اور واحد بخش بزدار شامل تھے۔ اس اجلاس کی صدارت مسعود اشعر نے کی۔

"کمال فن ایوارڈ" ہر سال کسی بھی ایک پاکستانی اہل قلم کو زندگی بھر کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جاتا ہے اور اس ایوارڈ کا اجرا "اکادمی ادبیات" نے 1997ء میں کیا تھا۔ اس ایوارڈ کے ساتھ پانچ لاکھ روپے کی رقم پیش کی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ اب تک "اکادمی ادبیات" پاکستان کی طرف سے احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، مشتاق یوسفی، احمد فراز، شوکت صدیقی، منیر نیازی، ادا جعفری، سوبھو گیان چندانی، ڈاکٹر نبی بخش، جمیل الدین عالی، محمد اجمل خٹک، عبداللہ جان جمالدینی، لطف اللہ خان اور بانو قدسیہ کو "کمال فن ایوارڈ" دیے جا چکے ہیں۔

"قومی ادبی ایوارڈ" برائے سال 2011ء

اُردو نظم کے لیے "ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ایوارڈ" منظر حسین اختر کی کتاب "سطر نو" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف حضرات: ڈاکٹر عامر سہیل، سرور جاوید اور منظر ایوبی تھے۔ اُردو نثر کے لیے "بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ایوارڈ" منشا یاد کی کتاب "دور کی آواز" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف حضرات ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر طیب منیر اور زاہدہ حنا تھیں۔ پنجابی زبان کے لیے "سید وارث شاہ ایوارڈ" ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی کتاب "موج میلا" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف پینل میں ڈاکٹر شہباز ملک، پروین ملک اور خالد فرہاد دھاریوال شامل تھے۔ سندھی زبان کے لیے "شاہ عبداللطیف ایوارڈ" فضل اللہ قریشی کی کتاب "کجھ یادوں کجھ گالھیوں" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف دُر محمد پٹھان، قلندر شاہ لکیاری اور الطاف شیخ تھے۔ پشتو زبان کے لیے "خوشحال خان خٹک ایوارڈ" ڈاکٹر جاوید خلیل کی کتاب "پشتو او مستشرقین" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف: ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک، فاروق سرور اور ایم۔ آر۔ شفق تھے۔ سرائیکی زبان کے لیے "خواجہ غلام فرید ایوارڈ" محمد اسماعیل احمدانی کی کتاب "یاداں دا خواب محل" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف: ڈاکٹر احسن رندھاوا، ڈاکٹر سجاد حیدر اور مسرت کلانچوی تھیں۔

براہوی زبان کے لیے "تاج محمد تاجل ایوارڈ" ڈاکٹر عبدالرحمان براہوی کی کتاب "بے بہا" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف: ڈاکٹر وحید ظہیر، پروفیسر خداداد گل اور عبدالحمید شاہوانی تھے۔ ترجمے کے لیے "محمد حسن عسکری ایوارڈ" محمود احمد قاضی کی کتاب "کتھا نگر" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف: ڈاکٹر سرور کامران، ڈاکٹر جعفر احمد اور محمد اسلم انصاری تھے۔

اس موقع پر چیئرمین اکادمی عبدالحمید نے "قومی ادبی ایوارڈ" برائے سال 2012ء کا اعلان بھی کیا۔ اُردو نظم کے لیے "ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ایوارڈ" خالد احمد کی کتاب "نم گرفتہ" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف: ریاض مجید، پروفیسر نذیر انجم اور جلیل عالی تھے۔ اُردو نثر کے لیے "بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ایوارڈ" ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "تنقیدی تھیوری کے سو سال" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف: مسعود اشعر، ضیا الحسن اور عطیہ سید تھیں۔ پنجابی زبان کے لیے "سید وارث شاہ ایوارڈ" زاہد حسن کی کتاب "تلھچیا اکھن والی" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف: اسلم کولسری، الیاس گھمن اور سلیم شہزاد تھے۔ سندھی زبان کے لیے "شاہ عبداللطیف ایوارڈ" ایاز گل کی کتاب "میلی جی تنہائی" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف پروفیسر محمد یوسف شیخ، بدر ابڑو اور شوکت حسین تھے۔ پشتو زبان کے لیے "خوشحال خان خٹک ایوارڈ" پروفیسر محمد نواز طاہر کی کتاب "تمپہ او ژوند" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف: عابد شاہ عابد، سیدہ حسینہ گل اور پروفیسر اسلم تاثیر آفریدی تھے۔ سرائیکی زبان کے لیے "خواجہ غلام فرید ایوارڈ" سلیم شہزاد کی کتاب "گھان" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف: محمد اسلم رسول جاپوری، شاکر علی شاکر اور پروفیسر رفعت عباس تھے۔ براہوی زبان کے لیے "تاج محمد تاجل ایوارڈ" منیر احمد بادینی کی کتاب "تینا ہیت تین ئن" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف: طاہرہ احساس جتک، ڈاکٹر عبدالرزاق صابر اور افضل مینگل تھے۔ انگریزی زبان کے لیے "پطرس بخاری ایوارڈ" اطہر طاہر کی کتاب "The Gift of Possession" کو دیا گیا ہے، جس کے منصف: افسر ساجد، ڈاکٹر آمنہ ناصر اور یاسمین حمید تھیں۔

(بشکریہ "دنیا")

ادبی خبریں/تقریبات

ڈاکٹر صغرا صدف کے اعزاز میں محفل مشاعرہ

معروف شاعرہ، محقق ایف ایم 95 کی اسٹیشن ڈائریکٹر اور پلاک کی ڈائریکٹر ڈاکٹر صغرا صدف کے اعزاز میں معروف ادبی تنظیم احتراف انٹرنیشنل اور بزمِ رضی نے مشترکہ طور پر محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا جس کی صدارت ملک کے نامور شاعر خالد شریف نے کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر صغرا صدف جبکہ مہمانِ اعزاز معروف شاعر عباس تابش تھے۔ نظامت کے فرائض نوجوان نسل کے معروف شاعر حسن عباسی نے سرانجام دیے۔ تقریب مقامی ریسٹورنٹ کے خوبصورت ہال میں منعقد ہوئی۔ محفل مشاعرہ میں اقرا اسلم، رقیہ غزل، نبیل احمد نبیل، وسیم عباس، حرا رانا، نوید انور، جاوید رضی، حسن عباسی، خاقان حیدر غازی، جاوید شیدا، ڈاکٹر ضیاء الحسن، حمیدہ شاہین، ڈاکٹر کوثر محمود، رُخسانہ نور اور زاہد عباس نے اپنا کلام پیش کیا۔ دیگر شعراء کی طرح مہمان اعزاز عباس تابش اور صاحب صدر خالد شریف نے بھی کلام سے قبل ڈاکٹر صغرا صدف کی فن و شخصیت پر گفتگو کی۔ آخر میں ڈاکٹر صغرا صدف نے تمام شعراء کا اور خاص طور پر میزبان جاوید رضی اور حسن عباسی کا شکریہ ادا کیا اور بار بار فرمائش پر اپنا بہت سا کلام سنایا۔ مشاعرے کے بعد ڈنر کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

گلشن ادب کا ماہانہ مشاعرہ

معروف ادبی تنظیم بزمِ گلشن ادب کے زیر اہتمام سلسلہ وار ماہانہ مشاعرہ ہفتہ کی شب پروفیسر عاشق راحیل کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا۔ مشاعرہ کی صدارت معروف ادیب گلزار حسین نے کی۔ جبکہ مہمان خصوصی اُردو اور پنجابی کے معروف ادیب عاشق راحیل تھے۔ مشاعرہ میں پروفیسر محمد عباس مرزا، پروفیسر رمضان شاکر، واجد امیر، سلطان کھاروی، عدل منہاس لاہوری، ہمایوں پرویز شاہد، اسلم شوق، اقبال راہی، عاصم خواجہ، محمد امین ایمی، فضل حق گلشن، نجمہ شاہین، فراست بخاری، ذاکر خواجہ، شاہد عباسی، میجر خالد نصر، رانا محمد اکرم، عبدالقدوس کیفی، بابو رمضان شاہد، عقیل شافی اور آخر میں مسعود احمد نے اپنا کلام پیش کیا۔

شعری مجموعہ ''سپنے بنتی آنکھیں'' شائع ہو گیا

شہر ظفر اقبال اوکاڑا کے ادبی اُفق پر روبینہ جلیل بینا کا نام طلوع ہوا ہے۔ اُس کا پہلا شعری مجموعہ ''سپنے بنتی آنکھیں'' کے نام سے منصۂ شہود پر اُبھرا ہے۔ کتاب پڑھ کر یہ گمان تک نہیں گزرتا کہ یہ شاعرہ کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ کیونکہ کلام میں برجستگی اور پختگی بھر طور اسی کی غمازی کرتی ہے۔ یاد رہے کہ روبینہ جلیل معروف شاعر احمد جلیل کی صاحبزادی ہیں۔ کتاب کی شراکت دار غزلیات و منظومات قاری پر بھرپور تاثر چھوڑتی ہیں۔ اس خوبصورت شعری مجموعے کا دیباچہ مسعود احمد نے تحریر کیا ہے۔ دلفریب ٹائٹل کے ساتھ اسے ایسکام پبلشرز اوکاڑا نے شائع کیا ہے۔ جس کی قیمت تین سو روپے ہے۔ روبینہ جلیل کی شاعری پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا ایک شعر آپ کے ذوق کی نذر ہے۔

چاندنی میں سلگنا ہے مجھ کو
بن کے دریا میں پیاس رہنا ہے

ادارۂ شعور اوکاڑا کے زیر اہتمام محفل موسیقی کا انعقاد زبیدہ خانم اور ریشماں کو خراجِ عقیدت

گزشتہ دنوں ادارۂ شعور (رجسٹرڈ) اوکاڑا کے زیر اہتمام ایک محفل موسیقی ڈاکٹر شمیم الحق کی رہائش گاہ پر انعقاد پذیر ہوئی جس میں ماضی کی معروف گلوکاراؤں، زبیدہ خانم اور ریشماں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ معروف کمپیئر پروفیسر محمد ریاض خان نے دونوں گلوکاراؤں کے فن کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ ڈاکٹر شمیم الحق نے بھی ان کی گائیکی کی بہت تحسین کی۔ پروفیسر امین انجم نے ان گلوکاراؤں کے گائے ہوئے گیتوں کو اپنی آواز کا آہنگ عطا کیا جس کی سامعین نے دل کھول کر داد دی۔ ڈاکٹر شمیم الحق نے ان کی ویڈیو کلیکشن سے سامعین کو مسحور کیا۔ ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے ماضی لوٹ آیا ہے۔ شعراء اور باذوق سامعین نے کثیر تعداد میں اس تقریب میں شرکت کی۔

روش گوجرہ کی 58ویں شعری نشست

گوجرہ کی معروف ادبی تنظیم روش کے زیر اہتمام 58 ویں شعری نشست قاری سردار محمد کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ دی ایلیٹ سکول میں منعقدہ نشست کی صدارت سید اجمل شاہ بخاری نے کی۔ مہمانانِ اعزاز پروفیسر محمد سلیم اقبال اور راجہ محمد یوسف قمر تھے۔ نقابت شاعر و مصور غزالی کے ذمے تھی۔ دیگر شعراء کرام میں بشارت علی ساحر، ظفر اقبال بادل، محمد سلیم کی، ڈاکٹر محمد حسین، جمیل عاجز، چوہدری صفدر علی، عامر ریاض، عامر ابرار علوی، علی اعجاز ساغر، خالد انصاری، بشیر ربانی، انور ندیم اور محمد انیس شامل تھے۔ نعت گو بزرگ شاعر قاری سردار محمد کی نعتیہ کتاب ''شاہکار کن فکاں'' پر بھی گفتگو کی گئی۔

پریس ریلیز

ساہیوال ( ) گزشتہ دنوں صدر دفتر رہائش گاہ محمد افضال حسین سہروردی، سہروردیہ نعت فاؤنڈیشن ساہیوال کے زیر اہتمام شہدائے کربلا کے حضور نذرانہ عقیدت و سلام پیش کرنے کے لیے سالانہ محفل مسالمہ کا انعقاد کیا گیا۔ نظامت کے فرائض پروفیسر ارجمند احمد قریشی نے بحسن و خوبی ادا کیے۔ تلاوت کلام پاک کی سعادت حافظ قاری محمد احمد فریدی نے حاصل کی۔ بارگاہ خیر الانام میں ہدیہ نعت پیش کرنے والوں میں معروف ثناخوان مصطفی محمد افضال حسین سہروردی اور ملک احتشام الحق شامل ہیں۔ پروفیسر سید ریاض حسین زیدی صدر جبکہ شیخ نصیر احمر مہمان خصوصی اور محمد فاروق اظہر مہمان اعزاز تھے۔ منعقدہ محفل مسالمہ میں پروفیسر غضنفر عباس سید، حسرت بلال اور شمشیر حسین زاہد نے بھی بارگاہ امام عالی مقام میں نذرانہ سلام پیش کیا۔ اس محفل میں شہر کی متعدد علم دوست شخصیات نے شرکت کی۔

پریس ریلیز

ساہیوال ( ) سخن دوست ویلفیئر فاؤنڈیشن ساہیوال (پاکستان) کے نام سے ایک نئی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ جس کا مقصد علم و ادب کی ترویج و اشاعت کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی تقریبات اور ماہانہ شعری نشستوں کا انعقاد ہے۔ تنظیم کے تحت نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی، طلباء و طالبات کے مابین علمی و ادبی موضوعات پر مباحثوں اور تقاریر کے مقابلہ جات کا انعقاد کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں یتیم طلباء و طالبات کی مالی امداد بھی کی جائے گی۔ اس حوالے سے ساہیوال اور دیگر شہروں کے شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کا ایک اہم اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں تنظیم کو حتمی شکل دینے کے لیے عہدیداران کا چناؤ کیا گیا جس کے مطابق محمد افضال حسین سہروردی صدر، محمد فاروق اظہر نائب صدر، حسرت بلال جنرل سیکرٹری، پروفیسر اسد نور جوائنٹ سیکرٹری، محمد قمر اعجاز سیکرٹری فنانس، وسیم نور سیکرٹری اطلاعات منتخب ہوئے۔ جبکہ مجلس عاملہ میں پروفیسر سید ریاض حسین زیدی، پروفیسر ارجمند قریشی، ایزد عزیز، علی رضا، متبسم محمود گیلانی ایڈووکیٹ، واصف سجاد، پروفیسر غضنفر عباس سید، پروفیسر محمد افتخار شفیع اور محمد اختر خان شامل ہیں۔

بزم پرنم کے زیر اہتمام نعت مشاعرہ

بزم پرنم کے زیر اہتمام نعتیہ مشاعرہ اور محفل سماع (بالخصوص عرس مبارک داتا گنج بخش علی ہجویریؒ) کے موقع پر پیر و مرشد سائیں بابر بشیر صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔

مہمان خصوصی عقیل احمد، رفعت علی علوی تھے اور نظامت کے فرائض اقبال پیام نے انجام دیے۔ ثنا خواں اصغر علی کے علاوہ دیگر شعراء کرام نے اپنا نعتیہ کلام پیش کیا۔ قوال میاں امیر خسرو عزیز نے قوالی پیش کی۔

دعائے خیر پیر و مرشد سائیں بابر بشیر صاحب نے کروائی اور اس کے بعد لنگر تقسیم کیا گیا۔

سانجھ سنگت کا قیام و محفل مشاعرہ

(لاہور) معروف شاعر ڈاکٹر نادر علی شاہ نے ایک ادبی تنظیم کا آغاز ''سانجھ سنگت'' کے نام سے کیا ہے۔ جس کا مقصد مختلف فنون لطیفہ کی ترویج ہے۔ اس سلسلے کی پہلی تقریب محفل مشاعرہ الحمرا لاہور ادبی بیٹھک میں ہوئی۔ جس کی صدارت ملک کے نامور آرٹسٹ شفیق فاروقی نے کی۔ مہمان خصوصی نامور شاعر، سفرنامہ نگار اور ماہنامہ ارژنگ کے مدیر حسن عباسی تھے۔ جبکہ مہمان اعزاز نمل یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی کے سربراہ راؤ کاشف تھے۔ مشاعرہ میں معروف شعراء سلیم گورمانی اور حرا رانا نے بھی بطور خاص شرکت کی اور اپنا کلام سنایا۔ نوجوان شعراء میں راول، اظہر، عظمی، زبیر نعیم اور ضمیر اطہر نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ صاحب صدر نے ''سانجھ سنگت'' کے قیام کو فنون لطیفہ کی ترقی و ترویج کے لیے اہم قدم قرار دیا اور تنظیم کے لیے دس ہزار روپے کے فنڈ کا اعلان بھی کیا۔

مبارک باد

معروف شاعر، افسانہ نویس اور محقق ''ناز اوکاڑوی'' کو اللہ تعالیٰ نے چاندی پوتی ''فجر'' سے نوازا ہے۔ ادارہ ''ارژنگ'' کی طرف سے ان کو دلی مبارک باد۔

تبصرۂ کتب

ردا کے سائے میں (حمد، نعت سلام) / شاعر: سید علی رضا کاظمی / صفحات: 176 / قیمت: 200 روپے / تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

ناشر: انٹرنیشنل سیرت کونسل پاکستان، فون 7322508

''ردا کے سائے میں'' معروف شاعر سید علی رضا کاظمی کا حمد، نعت وسلام پر مشتمل شعری مجموعہ ہے۔ جس میں انھوں نے اللہ تعالیٰ، حضور اکرمؐ اور اہل بیت کے حوالے سے عقیدت اور محبت کے پھول نچھاور کیے ہیں۔ ان کی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عقیدت کے ساتھ ساتھ تاریخ کا بھی گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ کتاب پر ڈاکٹر آغا سلمان باقر کا دیباچہ قابل مطالعہ ہے۔

ممکن (شاعری) / شاعر: سحر تاب رومانی / صفحات: 160 / قیمت: 250 روپے / تبصرہ نگار: حسن عباسی

ناشر: علی زبیر پبلی کیشنز، کراچی 021-32215102

''ممکن'' متحدہ عرب امارات میں مقیم معروف شاعر سحر تاب رومانی کا مجموعہ کلام ہے۔ سحر تاب رومانی اگر چہ طویل عرصہ سے یو اے ای میں مقیم ہیں۔ تاہم اُن کی شاعری کی خوشبو سرحدوں کو عبور کر کے جہاں جہاں اُردو ادب کی بستیاں آباد ہیں پہنچ چکی ہے۔ اُن کی نظم وغزل روایت اور جدت کا خوبصورت امتزاج لیے ہوئے ہے۔ دیار غیر میں رہ کر جدید رویوں کے ساتھ ہم آواز ہونا کار سہل نہیں لیکن سحر تاب رومانی اس کا گہرا شعور اور ادراک رکھتے ہیں۔ غزل میں ان کے موضوعات نئے اور اچھوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دل پذیر اسلوب کے باعث قارئین کا ایک حلقہ بنالیا ہے اور پاکستان اور یو اے ای کے ادبی حلقوں میں یکساں مقبول ہیں۔ اُمید ہے اُن کا شعری مجموعہ سنجیدہ ادبی حلقوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

جدا ہو کے دیکھیں (شعری مجموعہ) / شاعر: ڈاکٹر سعادت علی ثاقب / تبصرہ نگار: اظہر غوری / صفحات: 160 / قیمت: 250 روپے

ناشر: صوفی عنایت علی پبلی کیشنز، فیصل آباد

''جدا ہو کے دیکھیں'' ڈاکٹر سعادت علی ثاقب کا اولین اُردو غزلیات کا مجموعہ ہے۔ گو اس میں نعت ومنقبت بھی شامل ہے۔ تاہم شاعر کا طرز احساس غزلیہ روایت اور مترنم آہنگ سے کاملا ہم آہنگ ہے۔ گو ابھی پنجابی ادب کی تنقیدی کتب ہی شائع ہوئی ہیں۔ جب کہ'' پنجابی شاعری تے موسیقی دا سمبندھ'' کے علاوہ شعری مجموعہ'' ریشم ورتے'' زیر طبع ہے۔ تاہم ڈاکٹر سعادت علی ثاقب نے اُردو میں بھی اسی تخلیقی قوت اور اپج کو بہ روئے کار لا دکھایا ہے۔ جو جدائی اور روحانی اردات کے طور پر ان کی پنجابی تخلیقیت میں موجود ہے اور مسلسل ارتقائی ارتفاع کے مراحل طے کر رہی ہے۔

فنون لطیفہ کی ہر صنف اور ہیئت اگر چہ پر از کمال ہے۔ تاہم وہ فکری وفلسفیانہ انکشاف اور تخیلی انکشافات کے براہ راست اظہار کے تناظر میں تنگنائے سے بحر زخار میں منقلب کرنے کا خوگر ہوتا ہے۔ گو صنف وہیئت کی روایت سے روگردانی کے بغیر جدت طرازی ممکن نہیں، باوجود یکہ ڈاکٹر سعادت علی ثاقب نے اپنے تئیں اُردو شاعری

کے حدِ نظر میں محصور منظر نامے کو ماورائے بصارت اور بصیرت افروز بنانے کا کامیاب جتن کیا ہے۔

بادلے کتے (افسانے)/افسانہ نویس: نیر اقبال علوی/صفحات:192 / قیمت:300روپے/تبصرہ نگار: ڈاکٹر صلاح الدین حیدر

ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، لاہور 042-3735523

نیر اقبال علوی کے افسانے محسوسات کی دنیا میں سرگرداں اور ملفوف مادی مفادات اور اس حوالے سے سرشت انسانی کے بھید کا گہرا مشاہدہ سامنے لاتے ہیں۔ اُن کے چار افسانوی مجموعے بعنوان (۱) عالم سوز وساز (۲) جہانِ رنگ و بو (۳) سلسلہ روز و شب اور (۴) ہنگامہ رنگ وصوت بالترتیب منظر عام پر آ چکے ہیں۔ نیر اقبال علوی کسی بھی سچائی تک امکانی جستجو میں راستہ بنانے کی سعی کرتے ہیں اور اس عمل میں عالمگیریت کی تجریدی تصویروں کے سامنے لاتے ہیں۔ انھیں ترقی یافتہ دنیا کے مہذب معاشرے میں بھی انسانی سماج کے امکانات معدوم اور ابلا فریبی سے دوچار نظر آتے ہیں۔ وہ جن کرداروں کو اُجاگر کرتے ہیں، وہ سماج کی تہہ میں معاشی قوانین کی حرکت کو سمجھنے سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ عالمی منڈی میں محنت بیچنے والے خود محنت کی ''قوت'' کو سمجھنے سے گریزاں ہیں۔ اشتہاری دنیا کے پس منظر میں ذہن کو کنٹرول کرنے کی سائنسی انارکی کو ایک دائمی قدر کے رُوپ میں پیش کرتی ہے۔ نیر اقبال علوی صاحب اسی عالمگیریت میں اپنے سوالات کو افسانوی بنت میں پیش کرتے چلے جاتے ہیں اور بلاشبہ وہ اکیسویں صدی کے بحرانوں کے مصور ہیں۔

زرِ خزاں (شاعری)/شاعر: ڈاکٹر بدر منیر/صفحات:160 / قیمت:300روپے/تبصرہ نگار: ثاقب ملک

ناشر: مثال پبلشرز، فیصل آباد 0300-6668284

بدر منیر اثباتِ ذات کا شاعر ہے۔ اس کی زندگی کے اثباتی رویے، خیر و برکت پر ایمان اور انسانی رشتوں پر تیقن و اعتماد کا لہجہ اور ضبط و اعتدال کا وقار، اس کی شاعری میں ایک مختلف ذائقے اور نیرنگ منظر کا پیش لفظ بن کر اُبھرتا ہے۔ اس کے ہاں صرف فنی ریاضت کا سلسلہ ہی روایت سے پیوست نہیں بلکہ وہ فکری و تخیلی اعتبار سے بھی قلبی و باطنی واردات کے گداز اور جذبے کی گرفت میں مضبوطی سے جکڑا ہوا ہے۔ بدر منیر کے شعری سرمائے میں عصر حاضر کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ذوقِ جمال کی تسکین کے خوبصورت پیرائے بھی موجود ہیں۔ وہ حیات اور کائنات کو تنقیدی نظر کے علاوہ محبت کی نظر سے بھی دیکھتے ہیں اور محبت کی یہ نظر ان کا رشتہ ادب کی ان عظیم اقدار سے جوڑ دیتی ہے جو ہمیشہ سے عالم انسانیت کو بہت محبوب رہی ہے۔

بن تمہارے اُداس کوئی نہیں (شاعری)/شاعر: اقبال طارق/صفحات:192 / قیمت:300روپے/تبصرہ نگار: جاذب قریشی کراچی

ناشر: نامعلوم

اقبال طارق کے مزاج میں غزل کا سوندھا پن رچا بسا ہے لیکن نظم کی بھینی بھینی خوشبو بھی دامن پکڑتی ہے۔ اطمینان بخش امر یہ ہے کہ غزل اور نظم پر ان کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوتی اور مجموعی تاثر کے طور پر ایک مکمل اور بھرپور شاعر سامنے آتا ہے۔ اقبال طارق کی شاعری میں محبت، محبوب اور محبوبیت کے بہت سے رنگ، بہت سی خوشبوئیں، بہت سے اُجالے اور بہت سے خواب شدت کے ساتھ اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ اقبال طارق جانتے ہیں کہ زندگی کے دکھوں سے جو شکستہ پن پیدا ہوتا ہے وہ

آدمی کو آئینے کی کرچیوں جیسا بنا دیتا ہے۔

خوشبو میں نہاتے رنگ (شعری مجموعہ) / شاعر: عطاءالرحمن قاضی / حرفِ چند: افتخار عارف / صفحات: 136 / قیمت: 200 روپے

ناشر: نیلی بار پبلی کیشنز

گزشتہ چند برسوں میں صرف رباعیوں پر مشتمل کسی نوجوان شاعر کی یہ پہلی کتاب ہے۔ ان رباعیوں میں جمالیاتی تنوع بھی ہے اور موضوعاتی رنگا رنگی بھی۔ عروض میرا موضوع نہیں ہے۔ تھوڑی بہت آہنگ کی شد بد کی گواہی پر کہہ سکتا ہوں کہ فنی اعتبار سے بھی یہ کتاب آپ کو مطالعے پر متوجہ کرتی ہے۔ نوجوان شاعر عطاءالرحمن قاضی کی یہ خوبصورت کوشش، نئی نسل کے دوسرے شعراء کو رباعی کہنے پر مائل کر سکے تو یہ بھی ایک بڑی ادبی کامیابی ہوگی۔ اختصار و آہنگ کی دل کش و دل نواز فضا میں نمود کرنے والی یہ صنفِ شعر اگر رواج پا جائے تو یہ کسی بڑے ادبی کارنامے سے کم نہیں ہوگا۔ رباعی کے تمام چوبیس اوزان میں اپنے جوہر کا اظہار کرتے ہوئے عطاءالرحمن قاضی نے رباعی کی شعری جمالیاتی روایت میں متنوع موضوعات کو سمونے کی بہت کامیابی اور خوبصورت کوشش کی ہے جس کی داد دی جانی چاہیے۔

شال میں لپٹی رات (شعری مجموعہ) / شاعرہ: راشدہ ماہین ملک / حرفِ چند: منصور آفاق / صفحات: 150 / قیمت: 400 روپے

ناشر: نامعلوم

راشدہ ماہین ملک کی شاعری پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر تخلیق کا ایک ایسا آتش فشاں موجود ہے جس کی تپش فکر و فن کے موسموں پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ جس کے بہتے ہوئے لاوے نے اگر اپنی سمت درست رکھی تو بہت کم عرصہ میں یہ شاعرہ اردو زبان کی ایک اہم ترین شاعرہ قرار پائے گی۔ اس کا یہ شعری مجموعہ نئے امکانات کے اُفق وا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی فنی پختگی دیکھ کر رشک آتا ہے۔ اس کے مصرع کی کرافٹ بھی اس کی اپنی ہے اور اسے اس بات کی بھی خبر ہے کہ شعر کیسے وجود میں آتا ہے۔ لفظ کیسے بول پڑتے ہیں۔ حروف کے افق سے شاعری کیسے طلوع ہوتی ہے۔ مجھے اپنے اس دعویٰ کی دلیل کے لیے یعنی ثبوتِ حرفِ حق کے لیے کسی اور شے کی ضرورت نہیں۔ یہی رات کی شال میں لپٹی ہوئی صبح کتاب کافی ہے۔

سنانے کا ساتھ / (شعری مجموعہ) / شاعر: ریحان بشیر شاد / حرفِ چند: ناصر ملک / صفحات: 144 / قیمت: 200 روپے

ناشر: ساتھ پبلشرز، لاہور

ریحان کے ہاں لفظیات کے داؤ پیچ اور اُلجھاوے، بیاں کی پیچیدگیاں، اور ثقیل جملوں کی یورشیں نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی سادہ کاری کے سبب پڑھنے والے کو اپنا مسحور کر لیتا ہے۔ اس کے پاس اظہارِ خیال کی بھرپور توانائی اور جہانِ آرزو کا توانا احساس موجود ہے۔ اس کے لہجے کی کھنک، اشبا ہیں انداز اور جذباتی جارحیت اپنے روایتی انداز میں اس کا ساتھ دیتی ہے۔ یہ تاب و تمکنت اس کے ہاں شعر شعر میں موجود ہے۔

نامہ ہائے احباب

عزیز و مکرم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ ماہنامہ ارژنگ ماہ ستمبر مل گیا تھا۔ مطالعہ میں رہا۔ مگر ہاتھ کے رعشہ کی وجہ سے لکھنا مشکل ہوگیا ہے۔ اس شمارہ کے ٹائٹل کے آخری صفحہ پر آپ کے اعزاز میں منعقدہ تقریب کی روداد کی تصویری جھلکیوں کو دیکھ کر مسرت ہوئی اللہ تعالیٰ آپ کو مزید اعزاز سے نوازے۔

لاہور آیا تو آپ سے مکتبہ تعمیر انسانیت پر ملاقات ہوئی۔ آپ سے آپ کے مرکز پر ملنے کا ارادہ تھا مگر بارشوں نے یہ ارادہ وفا کرنے کا موقع نہ دیا۔ خانیوال واپس آ گیا۔

ایک مقالہ بعنوان ''جدید منزل کا توانا شاعر۔۔۔ حسن عباسی'' اپنے شاگرد کو بلا کر لکھوایا ہے۔ یہ مجھ پر قرض تھا جسے ادا کر رہا ہوں۔ گو قبول افتد تو ہے عز و شرف۔ شائع فرمایئے حمد، نعت اور غزل بھی ارسال ہیں۔ والسلام

اختر گوہر ملسیانی/خانیوال

مرقع حسن و خوبی ارژنگ نظر حسن عباسی صاحب

السلام علیکم۔ ارژنگ بدستور ہے۔ وہی ادائیں ''قیامت'' وہی فضائیں جنت۔ قیامت نظر، جنت نگاہ، ''ارژنگ'' پر خدا کا فضل ہے۔ خوب رنگ جما رہا ہے۔ آپ کی کرم فرمائی سے میرا اردو اور ہندکو کلام شائع ہوا ہے۔ ایک تو میری بدخطی ایک ہندکو لفظیت کی ''سرکشی'' ہندکو نظم کے دو لفظ نظر کئے ہیں۔ خون کی فون در آیا ہے اور پر (Wing) صرف پہ رہ گیا ہے۔ بہرطور آپ نے ہندکو کو لائق توجہ گردانا آپ کی مہربانی۔ ارژنگ کے مندرجات دل ربا ہیں۔ ''شعری گوشے'' میں جان عالم ''اچھے اچھے'' نظر آئے۔ نظم و غزل میں ان کا سٹائل ''دیدہ ور'' ہے۔ دو مفاعلن میں ان کی غزل کمال کی چیز ہے۔ مجھے بہت پسند آئی۔

ابھی تھکا نہیں ہوں میں
چڑھوں گا سیڑھیاں ابھی
دبا ہوا ہوں راکھ میں
ہوا نہیں دھواں ابھی
میں خود سے مل نہیں سکا
کہ میں ہوں درمیاں ابھی
(پڑا ہوں درمیاں ابھی)

جان عالم ہمارے ہزارے کی رونق ہیں۔ وہ تن تنہا مانسہرہ سے پائے کا ادبی رسالہ ''شعر و سخن'' نکالتے ہیں جس میں مشاہیر ادب کی نگارشات شائع ہوتی ہیں۔ ادب کے نئے آفاق اس کی وساطت سے سامنے آتے ہیں۔ جان عالم کا اداریہ فکر انگیز ہوتا ہے۔ وہ بڑے حسن سے فلسفے کو نثری شاعری کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ کسی حریف کو ''بیگا'' نہیں کرتے سب سے محبت کرتے ہیں۔ میں شعر و سخن کے دلدادگاں میں سے ہوں۔

خیر اندیش

آصف ثاقب/ایبٹ آباد

''ارژنگ'' کے بارے میں فون پر بات ہو چکی ہے۔ آپ کی محنت اور بھرپور کوششیں رنگ لا رہی ہیں اور اب کی بار ''ارژنگ'' پہلے سے کہیں بہتر آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ گوشے بھی بڑھے ہیں۔ لکھنے والوں میں بھی اضافہ ہوا ہے اور قارئین کرام بھی زیادہ ہوئے ہیں۔ میری دعا ہے کہ ''ارژنگ'' دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ آپ کی ہمت جواں رہے اور کوششیں جاری رہیں۔ (آمین)

نصرت صدیقی/فیصل آباد

ڈیئر حسن! کیسے ہیں؟

ارژنگ واقعی ایک خوبصورت پرچہ ہے۔ جس میں آپ کی ادارت کا حسن شامل ہے۔ نعت رسول کے صفحے کے لیے نعتیں اور غزل کے صفحے کے لیے غزلیں آپ کے لیے۔

مخلص

قیوم طاہر/راولپنڈی

حسن عباسی صاحب! السلام علیکم

ارژنگ کا تازہ شمارہ نومبر ۲۰۱۳ء نظر نواز ہوا۔ خوب سے خوب تر کا سلسلہ برقرار ہے۔ آپ کی نظر حسین تر اہتمام ادب کے لیے احسن اہداف پر مرکوز رہتی ہے۔ ڈاکٹر صغریٰ اصغر کی بھرپور فعال ادبی

شخصیت اور اُن کے ''وعدہ'' کی اشاعت ثانی کا احسن پاشا نے بنظر احسن جائزہ لیا ہے۔ کاش ''وعدہ'' کی ایک کاپی ہماری بھی دسترس میں آسکے۔ حافظ مظفر محسن کو حسن عباسی کے ساتھ منائے جانے والی دل نشیں شام (بمقام ساہیوال) میں دیکھا تھا۔ ان کے مختلف مزاح آلود تجزیوں میں وہ اپنے نام کی لاج رکھتے نظر آتے ہیں۔ ''عوامی صدر، عوامی ادیب اور عوامی چور'' میں ان کے قلم سے متعدد چوری کی ''واردات'' کو خوب گرفت میں لیتا دکھایا گیا ہے۔

سید ریاض حسین زیدی/ساہیوال

محترم حسن عباسی! اسلام مسنون

''ارژنگ'' کے لیے چند غزلیں ارسال ہیں۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئیں گی اور سنائیں آپ کیسے ہیں؟ کیا خبریں ہیں؟

شیخوپورہ کے احباب سلام کہہ رہے ہیں۔

اظہر عباس/شیخوپورہ

محترم حسن عباسی صاحب!

سلام مسنون! اُمید ہے بمعہ اہل خانہ بخیر و عافیت ہوں گے۔ خاکسار کو نیر اقبال علوی کہتے ہیں۔ عرصہ 1972 سے جرمنی میں مقیم ہوں۔ اُردو زبان و ادب سے رغبت کے ساتھ ساتھ افسانہ لکھتا ہوں۔ پانچ افسانوں کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ آپ ماشاءاللہ لاہور کی ادبی دنیا میں معروف شخصیت ہیں اور آپ کی ادبی خدمات بھی قابل صد تحسین۔ اسی لیے آپ کو بڑی نیازمندی کے ساتھ ایک تازہ افسانوں کا مجموعہ ہم؟..... پاؤلے کتے ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ کی طبع پہ ناگوار نہ گزرے گا۔ آپ کی ناقدانہ رائے کا بے تابی کے ساتھ منتظر رہوں گا۔

نیر اقبال علوی/جرمنی

قابل احترام برادر محترم حسن بھائی!

السلام علیکم۔ اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ حسب الحکم گوشے کے لیے غزلیں اور کچھ مزید چیزیں ارسال خدمت ہیں۔ قبول فرمائیں۔

آپ کی محبتوں کا بے حد شکریہ سب کو سلام

طالب دُعا

ریاض ندیم نیازی/سبی

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ بعد از سلام آپ کی اور تمام احباب کی خیریت کے لیے دُعا گو ہوں۔ آپ کی محبتوں، چاہتوں اور دلی التفات کا تہہ دل سے ممنون اور مشکور ہوں۔ حسب گزارش اپنی چند اور غزلیں اور نظمیں ارسال خدمت ہیں جو چاہیں جیسے چاہیں کریں۔ کیونکہ ہم تو ٹھہرے طفل مکتب اور آپ ماشاءاللہ اُستادِ فن۔

بہر حال میں اپنی نگارشات سے زیادہ اس چیز میں دلچسپی رکھتا ہوں کہ آپ کی شاعری پر جو تبصرہ ارسال کیا ہے وہ شائع ہو۔ والسلام

ڈاکٹر محمد عثمان/پشاور

حسن عباسی جی!

السلام علیکم۔ ''ارژنگ'' مسلسل مل رہا ہے۔ محنت آپ کر رہے ہیں اور فائدہ ہم لوگ اُٹھا رہے ہیں۔ ارژنگ جیسا رسالہ چھپنے سے مضافاتی ادیبوں، شاعروں کو تحریک ملتی رہتی ہے۔ ارژنگ ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہمت میں مزید اضافہ فرمائے۔ ''سال نو'' پر ایک نظم اور ایک ''ادبی خبر'' پیش خدمت ہے۔ دیگر سٹاف کو سلام۔

والسلام

غزالی/گوجرہ

بھائی حسن صاحب! السلام علیکم

آپ کے ادبی جریدہ ارژنگ کے لیے اپنی دو غزلیں اور ایک تازہ ترین مضمون ارسال کر رہا ہوں۔ قبول فرمائیے۔

فقط آپ کا بھائی

حسن جمیل/واہ کینٹ

برادرم جناب حسن عباسی!

السلام علیکم۔ اُمید واثق ہے کہ رب ذوالجلال کے فضل و کرم سے بخیریت ہوں گے۔

ماہنامہ ارژنگ نومبر 2013ء کا شمارہ موصول ہوا۔ بہت شکریہ کہ آپ نے یاد رکھا۔ آئندہ شمارے کے لیے دو تازہ غزلیں بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ شامل اشاعت کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔ والسلام

ارشد محمود ارشد/سرگودھا

شہزادے

عاشق رحیل/لاہور

پرانے زمانے وچ شہزادے بادشاہاں دے گھر پیدا ہوندے سن۔ ایہناں دے جمن تے بڑیاں خشیاں منائیاں جاندیاں سن۔ محل دو محلے سجائے جاندے، خیرات ونڈی جاندی۔ خشی دیاں نوبتاں وجائیاں جاندیاں۔ ملک دے کونے کونے وچ شہزادے دی لمی عمر دیاں دعاواں منگیاں جاندیاں سن۔ ایہ اودوں دی گل اے جدوں پوری دنیا تے بادشاہاں دا ای راج ہوندا سی۔ ہر ملک وچ بادشاہ سلامت ہوندے سن۔ ایس لئی ہر ملک وچ شہزادے دا ہونا وی ضروری سی۔ شہزادے ملک دا شنگار ہوندے سن۔ سگوں بادشاہاں نوں فکر ہوندی سی کہ جے شہزادا نہ جمیا تاں خورے اوہناں دی بادشاہت کنہاں دے ہتھاں وچ چلی جاوے گی۔ بادشاہ تاں اپنے بھراواں نوں وی برداشت نہیں کردے سن۔ کوئی بھرا انھا کردتا جاندا تے کوئی اصلوں ای مار مکایا جاندا۔ بادشاہاں نوں شہزادے جمن لئی بھاویں کنے وی ویاہ کرنے پیندے، اوہ عوام دی بھلائی لئی کر گزردے۔ ظاہر اے کہ بادشاہ توں بعد شہزادے نے ای بادشاہ بننا ہوندا سی۔ ایس لئی شہزادے بادشاہ دی موت دی اڈیک وچ رہندے۔ بلکہ اکثر شہزادیاں نوں تاں بادشاہ دی موت دا بندوبست وی پلیوں ای کرنا پیندا سی۔ پر نیک دل، فرمانبردار تے شریف قسم دے شہزادے بادشاہ بنن دی آس وچ بڈھے ہو جاندے تے تے بادشاہت دی حسرت ای دل وچ لے کہ دنیا توں رخصت ہو جاندے۔

بچپن وچ پریاں تے شہزادیاں دیاں کہانیاں پڑھیاں تے سنیاں سن۔ ذرا وڈے ہوئے تاں ڈراما "انارکلی" وچ شہزادے سلیم دا بانکپن، سہپن تے حلیے بارے پڑھیا سی۔ ایس لئی کوئی شہزادا ویکھن دی دل وچ بڑی سدھر سی۔ اک دن اخبار وچ پڑھیا کہ کسے ملک دے شہزادا صاحب پاکستان تشریف لیا رہے نیں تے اوہ مال روڈ توں لنگھ کے شاہی قلعہ ویکھن جان گے۔ اسیں شہزادا صاحب نوں ویکھن لئی بے تاب ساں۔ ایس لئی اوہناں دا دیدار کرن لئی اسیں وی مال روڈ جا اپڑے۔ اگے لوکاں دا اک زبردست ہجوم سی۔ اوہ وی ساڈی طرح شہزادا ویکھن آئے سن۔ اسیں ایہو جہی تھاں لبھ لئی جتھوں شہزادا صاحب دا نظارہ چنگی طرح ہو جانا سی۔ ساڈے تصور وچ شہزادا سلیم دی خوبصورتی، جوانی، چمک دمک والا لباس تے سر تے مغلئی تاج سی۔ پر جدوں اوہناں دی سواری آئی تاں ساڈیاں اُمیداں تے تریل پے گئی۔ کیوں جو شہزادا صاحب عام جہے کپڑیاں وچ سن تے اوہ اینے بڈھے ہو چکے سن کہ اوہناں دیاں بھواں دے وال وی چٹے نظر آ رہے سن۔ نہ کروفر تے نہ بانکپن۔ اوہ تاں ساڈے بزرگاں ورگے ای بزرگ سن۔ اساں سوچیا ایہو جہے ہوندے نیں شہزادے؟

ہن جمہوریت دا دور آ گیا اے۔ بادشاہتاں مک گئیاں نیں۔ ہن بادشاہیاں تے صرف بالاں دیاں کہانیاں وچ رہ گئے نیں یاں فیر تاش دے بونجا پتیاں وچ۔ دو تن اصلی بادشاہ وی ایس دنیا وچ موجود نیں پر انج لگدا اے جویں ایہ بادشاہ لوکاں نے نمونے دے طور تے آثار قدیمہ دی نادر چیز سمجھ کے رکھے ہوئے ہون۔

تواریخ توں واقف سبھ لوک جاندے نیں کہ بادشاہاں نوں شہزادیاں لئی بڑی تنگ و دو کرنی پیندی سی۔ کئی کئی ویاہ کرانے پیندے۔ بلکہ کئی بادشاہاں نوں تاں بھیڈاں بکریاں دے واڑے وانگوں رانیاں، مہارانیاں تے بیگماں دے حرم وی رکھنے پیندے سن تے اوہناں نوں خش رکھن لئی اوہناں دے حسن دے مطابق خطاب دین لئی کئی سوجھوان قسم دے تن وی رکھنے پیندے سن۔ فیر شہزادے دے جمن تے اوہدی پرورش تے حفاظت دا ذمہ وی آ پیندا سی۔ جویں جویں شہزادا جوان ہوندا جاندا تاں بادشاہ دی اپنی حفاظت دا وی مسئلا پیدا ہونا شروع ہو جاندا۔ ایس لئی بادشاہ نوں اپنے فرمانبردار قسم دے لوک شہزادے دے اتالیق مقرر کرنے پیندے تے اک سی آئی ڈی دی قسم دا محکما وی قایم کرنا پیندا جہدے نال کئی بے کار قسم دے لوکاں نوں روزگار مل جاندا۔ شہزادیاں دی دلجوئی تے اوہناں دے رجھیویاں لئی جاگیراں تے کنیزاں وی بخشنیاں پیندیاں سن۔ سگوں بعض شوقین قسم دے شہزادے تاں اپنے پیو دیاں کنیزاں تے وی مل مار لیندے سن تے کنیزاں دی پیو نالوں پتر نال زیادا خش رہندیاں سن۔

اج دا زمانا وی عجیب زمانا اے۔ ہن بادشاہواں دا دور نہیں رہیا پر شہزادے پہلے نالوں زیادا پیدا ہونے شروع ہو گئے نیں۔ شہزادیاں توں جمن لئی بادشاہاں دی کوئی لوڑ ای نہیں رہی۔ پہلاں شہزادے محلاں وچ پیدا ہوندے سن پر اج دے شہزادے محلیاں وچ پیدا ہونے شروع ہو گئے نیں۔ عام گھراں وچ ایہناں دی پیدائش کجھ ودھ گنتی وچ ای ہو رہی اے۔ بادشاہاں دے گھر جمن والے جمدیاں ای شہزادے کہاوندے سن۔ پر اج کل دے شہزادیاں نوں آپ شہزادا بننا پیندا اے یاں اوہناں نوں بنایا جاندا اے۔ گلیاں محلے، پنڈ، شہر، کالج، دفتر تے فیکٹریاں کوئی تھاں ایہناں شہزادیاں توں خالی نہیں۔ سگوں پورا ملک ای شہزادیاں دے ہتھاں وچ اے۔ تساں غور کیتا ہووے گا کہ جتھے جتھے رکشے چلدے نیں، ہر رکشے

دے پچھے گھٹ توں گھٹ دو شہزادیاں دا تاں ضرور لکھیا ہوندا اے۔ اک پاسے ''پپو شہزادا'' تے دوجے پاسے ''نھو شہزادا'' ایہ پپو تے نھو شہزادے وڈے ہو کے بادشاہ نہیں بندے۔ کوئی رکشا ڈرائیور، کوئی مستری تے ودھ توں ودھ کوئی رکشے دا مالک بن جاندا اے تے اوہ تاں ای ہور شہزادے پیدا کرن وچ جٹ جاندا اے۔

ساڈی زندگی دے ہر شعبے وچ شہزادیاں دا راج اے۔ گھر دا اوہ پتر جیہڑا کم کار کرن توں بچ کے نسدا ہووے، ویہلا بیٹھ کے کھان دا عادی ہووے، ماں پیو نوں ڈرا دھمکا کے اوہناں تے رعب پا کے اوہناں کولوں پیسے اینٹھدا رہووے، اوہ شہزادا اکھواندا اے۔ یار دوست وی اوہنوں گلیاں باتیں شہزادا گل ای بنائی رکھدے نیں۔ اوہ یاراں دوستاں دی محفل وچ جاندا اے تاں اوہنوں ''جی آیاں نوں'' کجھ انج آکھیا جاندا اے ''اوہ آ گئے نیں ساڈے شہزادے''

تے شہزادا ہوری ککڑ وانگ سینا پھلا لیندے نیں۔ تہاڈا وی ایہو جیہے کئی شہزادیاں نال واہ پیندا ہووے گا۔

گھر دے شہزادے توں بعد محلے دا شہزادا ہوندا اے جیہدا سارے محلے تے راج ہوندا اے۔ اوہدا کم شریف لوکاں تے ناجائز رعب پا کے اپنی شہزادگی قایم رکھنا ہوندا اے۔ نہ اوہدی اپنی کوئی عزت ہوندی اے تے نہ اوہ دوجے دی عزت دی پرواہ کردا اے۔ اوہ ہر کسے دے پت لاہ کے اوہدے ہتھ وچ دین لئی تیار رہندا اے۔ پہلاں ٹیکس بادشاہ وصول کردے ہوندے سن پر ہن ایہ شہزادے کردے نیں جیہدا ناں اوہناں ''غنڈا ٹیکس'' رکھیا ہوندا اے۔

سکولاں کالجاں دے شہزادیاں دی شان ای نرالی ہوندی اے۔ ایہ اتھے تعلیم حاصل کرن نہیں آوندے بلکہ اپنے استاداں تے کالج دی انتظامیا اتے حکومت کرن لئی آوندے نیں۔ ایہ کالج دی حکومت وچ حزب مخالف دا کم دیندے نیں۔ ایہ اپنے ہتھ وچ کتاباں پھڑنا اپنی شان دے خلاف سمجھدے نیں۔ ہاں ایہناں دی جیب وچ پستول ضرور رہندا اے۔ ایہ شہزادے کلاساں وچ آون دی زحمت ای نہیں فرماندے۔ جے آون وی تاں اپنی آن بان وکھاندے کمرے وچ انج آوندے نیں جویں شہزادا نہیں بلکہ کوئی بادشاہ سلامت اپنی رعایا تے احسان کرن لئی آ رہیا ہووے۔ ایہناں لئی ویلے دی وی کوئی پابندی نہیں ہوندی۔ جد جی چاہیا آ جان تے جدوں دل کیتا، اُٹھ کے چلے جان۔ علم دا حصول ایہناں لئی کوئی حیثیت نہیں رکھدا۔ ایہناں دا سبھ توں وڈا فرض کلاساں دا بائیکاٹ کروا کے ہڑتال کروانا ہوندا اے تاں جو ساڈی قوم کدھرے زیادہ ای پڑھ لکھ نہ جاوے۔

دفتراں دے شہزادیاں دی شان ای کجھ ہور ہوندی اے۔ دفتر وچ ایہناں دی کرسی ایہناں نوں اڈیکدی رہندی اے۔ پر ایہ اوہنوں اپنی تشریف آوری ای نہیں بخشدے۔ دفتراں وچ شہزادے دی درجا بدرجا ہوندے نیں۔ کوئی وڈا افسر شہزادا ہووے تاں اوہنوں ضروری میٹنگاں تے سرکاری دورے ای ویہل نہیں لین دیندے۔ اوہ اپنے توں وڈے افسراں نوں خوش کرن رجھے رہندے نیں کیوں جو ایہ اگل اوہناں دے فرض منصبی وچ شامل ہوندی اے۔ اوہناں نے عام پبلک توں لیناں دی کیہ ہوندا اے۔ عام بندیاں دے مسئلے تاں مک ای نہیں سکدے۔ ایس لئی اوہ اپنا قیمتی وقت ایہناں تے تاں نہیں گوا سکدے۔ فیر جنے وڈے افسر اوتنے وڈے کم۔

کلرک تاں شہزادا بن توں پہلاں ای بادشاہ بن جاندے نیں۔ لوک ایویں تاں نہیں اوہناں نوں ''کلرک بادشاہ'' آکھدے۔ اوہناں وچ بادشاہاں والیاں ساریاں خوبیاں ہوندیاں نیں۔ ایہناں دی پورے دفتر تے حکومت ہوندی اے۔ کسے دی کیہ مجال کہ اوہ اوہناں کولوں زبردستی کم کروا لوے۔ اوہناں دا کم تاں سائلاں دے نال نال افسراں نوں وی تنگ کرنا تے اوہناں دیاں کمزوریاں دی بھال وچ رہنا ہوندا اے۔ ایہناں نوں تنخاہ دی پرواہ وی نہیں ہوندی۔

سیاسی شہزادے تاں واقعی شہزادے ہوندے نیں۔ ایہناں بارے لکھنا ویلا ضائع کرنا اے۔ ایہناں بارے لکھدیاں ڈر وی آوندا اے کیوں جو کیہ پتا ایہ شہزادے کدوں بادشاہ بن جان تے ملک وچ ایہناں دا سکا چلن لگ جاوے۔

دوجیاں شہزادیاں وانگوں ادب وچ وی بہت سارے شہزادے جمن لگ پئے نیں۔ ایہ شہزادے جناں گھٹ لکھدے نیں، ایہناں دی شہرت اونی ای ودھ ہوندی اے۔ بلکہ ایہناں دی شہرت تاں پاکستانوں باہر پاکستان نالوں ودھیری اے۔ کیوں جو ہیرے دی قدر تے چمک دمک کھان وچوں نکلن توں بعد ای ہوندی اے۔ ایہناں دی اپنے ملک وچ گھٹ تے باہر زیادہ منگ ہوندی اے۔ مڈل ایسٹ، یورپ تے امریکا وچ تاں ایہناں نال پرنساں والا سلوک ہوندا اے۔ ایہ شہزادے اپنے دیس دیاں ادبی تقریباں وچ آونا اپنی شان دے خلاف سمجھدے نیں۔ ایہ وچارے وی کیہ کرن، مجبور نیں۔ دوجے دیساں دے عقیدت مند ای ایہناں نوں ویہل نہیں لین دیندے۔ کیوں جے ایہناں دے نال نال اوہناں ملکاں دے لکھاریاں نوں اپنی شہرت دا وی تاں خیال ہوندا اے۔ جے اوہ ایہناں دا خیال کردے نیں تاں ایہ وی تاں خیال ہوندا اے۔ جے اوہ ایہناں دا خیال کردے نیں تاں ایہ وی تاں اپنے احسان فراموش نہیں ہو سکدے۔

سانوں اپنی خوش قسمتی تے ناز کرنا چاہیدا اے کہ اسیں ''شہزادا گھر'' وچ جی رہے آں۔ کیہ پتا سانوں وی کدی شہزادا بنن دا موقع مل جاوے۔

حافظ افتخار گجراتی

کیوں ہن جگراتے کٹنے   راتاں چپ نیں تارے چپ نیں

حافظ افتخار قرآن پاک دے حافظ ہون دے نال نال دنیاوی تعلیم دے نال وی مالا مال نیں۔ فنی تعلیم دے ماہر ہون پاروں دیپال پور شہر وچ طالب علماں نوں تکنیکی علم پڑھا رہے نیں۔ ایہدے نال نال افتخار ہوریں ادبی ذوق وی رکھدے نیں۔ اپنی ماں بولی نال پیار کردیاں ہویاں پنجابی دی ہر صنف وچ شاعری کردے نیں۔ جیویں حمد، نعت، سلام، منقبت، غزل، نظم، گیت، رباعی، یک مصرع، ماہیا، دوہڑا سمیت بحرنواں مزاج رکھدے نیں۔ پہلے پہل تخلص ساجد تے ہن پکا ای حافظ رکھ لیا اے۔

کاہنوں ایڈ کھلارا کریے
ہووے جنویں گزارا کریے
کنویں تے کاہنوں وتھاں پچھاں
کجھ تے یار نتارا کریے
ڑے جگن من جاندے نیں
ڈھڈوں جے کوئی چارا کریے
ایہہ دنیا نئیں وسن دیندی
ایتھوں چل کنارا کریے
تھاں یاری دی غرضاں ملی
کیہ ہن حافظ یارا کریے

بھائیاں باجھوں عزت کیہ اے
پتراں باجھوں دولت کیہ اے
پل وچ تولہ پل وچ ماشہ
خورے اوہدی عادت کیہ اے
آپے ساتوں زہراں دے کے
آپے پچھن حالت کیہ اے
جس دے بچے بھکھے سوں گئے
اس توں پچھو غربت کیہ اے
توں ایں ہجیں توں ایں جانیں
ربا تیری قدرت کیہ اے

بولن والے مر جاندے نیں
مارے گئے تے حیرت کیہ اے
حافظ سپاں وانگوں ڈنگدے
بندیاں دی وی فطرت کیہ اے

کیتی گل نوں پالن اوکھا
دکھ بے گانہ جالن اوکھا
گلیں باتیں سارے مردے
مر کے یار وخالن اوکھا
فکراں دے وچ ننگھوں لنگھدا
ٹکر پانی سالن اوکھا
خورے کس مجبوری پاروں
ہار پرویا مالن اوکھا
اک واری ڈگ پئے تے فر
ہوندا ڈھیر سنبھالن اوکھا
حافظ دل دے اتھرواں نوں
شعراں دے وچ ڈھالن اوکھا

سبھ لشکارے گونگے ہوئے
چن تے تارے گونگے ہوئے
رولا پان سکھی سارے
درداں مارے گونگے ہوئے

ہولے کیتوں بولن بھائیا
بھارے بھارے گونگے ہوئے
اکھاں چپاں جیہاں وٹیاں
نیر وچارے گونگے ہوئے
گل کھیڑاں دی کنوں پچھے
جتے ہارے گونگے ہوئے
حافظ کون جواب دوے گا
لوکی سارے گونگے ہوئے

جتے چپ نیں ہارے چپ نیں
اک دو تے نئیں سارے چپ نیں
کیتوں ہن جگراتے کٹنے
راتاں چپ نیں تارے چپ نیں
ویلے نوں انج جندرے لگے
موہم سوہے پیارے چپ نیں
دھیاں دے اج ویچ پتولے
ماپے ویر وچارے چپ نیں
ہولے اوتھے کیہ بولن گے
جتھے بھارے بھارے چپ نیں
جنہاں کجھ نئیں کیتا بولن
جنہاں ڈاکے مارے چپ نیں
نال کدھے ہن گلاں کریئے
کندھاں ویہڑے ڈھارے چپ نیں
اکھ جے حافظ زندہ ہووے
ہوندے کدوں گزارے چپ نیں

چونویں شاعری

دل نوں اپنی ہستی دا چارہ گر بنا لیندے
میں تے اوہ جے مل جاندے اک نگر بنا لیندے
دربدر نہ میں پھردا دربدر نہ اوہ ہندا
اک جگہ تے مل کے جے اپنا در بنا لیندے
خواب جے نہ بن جاندے میکدے دی دُنا وچ
ایہہ عذاب دُنیا دے دل چ گھر بنا لیندے
ہن خیال آندا اے منزلاں دی تنگی وچ
کوئی یار تے اپنا ہم سفر بنا لیندے
رہبراں بناں چلنا کم ستیر اوکھا سی
پر گواچ جاندے جے راہ بر بنا لیندے

منیر نیازی

روگ اوّلے، درد کولے، ہوکے دن سونے
سجناں نے دتے نیں سانوں تحفے دن سونے
فٹ پاتھاں تے رُلدی خلقت بھاں بھاں کردے بنگلے
میریاں دو اکھیاں نے ڈِٹھے جلوے دن سونے
مونہوں بول کے وکھو وکھرے قصے پئے سناون
قبراں اتے لگے ہوئے کتبے دن سونے
کوئی آکھے جھلا ولا، کوئی کہوے آوارہ
پیار ترے وچ لبھے سانوں تمغے دن سونے
بنیاں نیں لیکھاں دیاں لیکاں سوچاں رنگ برنگیاں
پہلی عمرے وہندے رہے آں سفنے دن سونے
کیہ ہویا جے بجھ گئیاں نیں پلکاں دیاں مشالاں
دل دے اندر بلدے نیں پئے دیوے دن سونے

حفیظ تائب

پھگن آوے، چیتر آوے
پت جھڑ اک دن سر پہ آوے
اٹھے پہر مرے کن وجدے
اک آواز برابر آوے!
تا تیل ہوا دا جھولا
باری کھلیاں فر فر آوے
خالی شاخاں جھول رہیاں نیں
کوئی تے چڑی جناور آوے
پچھلی رات دا ویکھ کے تارا
ایویں رون نوں جی کر آوے
میں جد وی سر چکنا منظر
سن کر دا اک پتھر آوے

بشیر منظر

رنگا بھریا ذرا فسانے وچ
آ گیا میں ترے نشانے وچ
سب زمانے عظیم ہندے نے
اک زمانہ اے ہر زمانے وچ
واج آوندی اے تیری جھانجر دی
رات میرے غریب خانے وچ
تیرے ہجے بدن دی خوشبو اے
میرے ساہ دے نگار خانے وچ
سوہنی، سسی دا جو گھرانہ اے
توں وی شامل ایں اُس گھرانے وچ

میرے لب تے ترانہ رانجھے دا
ہیر وانگوں توں اُس ترانے وچ
سوہنے پڑھدے صفی دے شعراں نوں
اک اضافہ تو اس خزانے وچ

سرفراز انور صفی

کدے میدانوں نسیا نہیں
میں دشمن توں جھکیاں نہیں
اوس توں وڈا ظالم کوئی نہیں
جنے ظلم نوں ڈکیا نہیں
پیار دے پینڈے کنڈیارے نہیں
کے میں تینوں دسیا نہیں
ویکھ میں تیری اُڈیک دا کھوہ
گیڑ گیڑ کے تھکیا نہیں
ہولی ہولی چوے گا
دکھ دا پھوڑا پکیا نہیں
مہنگائی دے سپ دے کولوں
ایتھے کوئی وی بچیا نہیں
اوہدے بعدوں میری اکھ نوں
تاز کوئی وی جچیا نہیں

وحید تاز

تبصرہ، خبراں تے خط

نام کتاب: آساں / تبصرہ: بازاوکاڑوی

پبلشر: ادارہ لکھاریاں، جیا موسیٰ شاہدرہ، لاہور

حکیم نذیر احمد نذیر ہوراں دی کتاب آساں 2013 وچ چھپ کے مارکیٹ وچ آئی اے۔ نذیر ہوریں پیشے دے لحاظ نال حکیم نیں۔ نال نال ادبی ذوق وی رکھدے نیں۔ جتھے اے نبض ویکھ کے مریض لئی دوا تجویز کردے نیں اوتھے ایہہ معاشرے دی نبض نوں وی گوہ نال ویکھدے تے اوہناں دے اپا کردے نیں۔ نذیر ہوراں اپنی کتاب وچ پرانے شاعراں دی پیروی کردیاں ہویاں اپنے توں پہلے شاعراں دے پچھے ٹردیاں ہویاں اوہناں قدماں دے نشاناں نوں اپنی شاعری دا مدھ بھدیاں ہویاں حمد، نعت، قافی، منقبت تے روایتی شاعری بارہ ماہ تے چرخا لکھ کے اج دے دور وچ اس صنف نوں زندہ رکھن دی کوشش کیتی اے۔ اج کل بارہ ماہ تے چرخا اُتے شاعری ورے ورے ای لکھی پڑھن نوں ملدی اے۔ نذیر ہوری اس کوشش وچ کامیاب کھلتے نظر آوندے نیں۔

ایس مجموعہ ''آساں'' توں پہلاں وی نذیر ہوری دو وڈیاں اہم کتاباں کے اداریاں تے پڑھن والیاں توں داد وصول کر چکے نیں۔ جیہدے وچوں 1992 وچ سورۃ کہف دا پنجابی ترجمہ تے تفسیر ''اصحاب کہف'' نوں بہت سراہیا گیا تے سعود کھدر پوش ولوں انعام وی ملیا۔

مینوں امید اے پئی ''آساں'' دی پڑھن والیاں نوں ضرور پسند آئے گی۔

بزم سانجھ هڈالی دا مشاعرہ تے تعزیتی اجلاس

زبان و ادب دے فروغ تے ماں بولی دی سیوا کرن والی هڈالی دی ادبی تنظیم بزم سانجھ دا مہینہ وار مشاعرہ تے زبیدہ خانم تے ریشماں دی وفات تے پرکھ اکٹھ ملک محمد طاہر اعوان ایڈووکیٹ دی صدارت بیٹھاں ہویا اچیچے پروہنیاں وچ عبدالمالک کھچی تے رانا محمد اکرم شامل سن۔ جدکہ مشاعرہ وچ ادب دوست عبدالحمید گولڑوی، محمد رمضان اعوان، عبدالغفار بھٹیسن، رب نواز بالی، ڈاکٹر غلام حسین تے ملک امجد اعوان توں وکھ شائقین دی وڈی تعداد نے شرکت کیتی۔ مشاعرے دا آغاز تلاوت کلام پاک توں ہویا بزم سانجھ دے صدر محمد علی اسد بھٹی نے تلاوت کلام پاک دی سعادت حاصل کیتی۔ شمس الحسن بیتاب تے نصراللہ نے نعت پڑھی۔ سٹیج سیکرٹری دے فرائض عمر حیات محسن نے نبھائے جنہاں شاعراں نے کلام پڑھیا اوہناں وچ عمر حیات محسن، شمس الحسن بیتاب، سرفراز کاوش، معراج هڈالوی، عمران سوہارا، احمد نواز خالد، سجاد حسین سجاد، محمد حسین امر تے شاہ زیب اعوان شامل سن۔

بیت بازی کے بعد معروف شاعرہ شگفتہ ستارہ کا

مرتب کردہ دوسرا انتخاب

بے مثال بیت بازی

مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگیا ہے

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفرید سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310 / 042-7351963

اساں سرائیکی دے مہاندرے

شاعر تے نویکلے ناول نگار

سلیم شہزاد ہوراں کو

انہاندے ناول

گھانڑ

اُتے قومی ادبی ایوارڈ ملن

تے مبارک باد ڈیندے ہیں

(ماہنامہ ارژنگ)

شاہد علی خاں کی زیرادارت

شائع ہونے والا اُردو کا منفرد اور

معتبر جریدہ

الحمراء

شائع ہوگیا ہے

اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

یا براہ راست منگوائیں

0333-4001844

(بائیں سے دائیں) رخشندہ نوید، رخسانہ نور، عامر بن علی، ڈاکٹر حنان، ڈاکٹر صغرا صدف، رشین ادیبہ عالمی امن کانفرنس کے موقع پر

ڈاکٹر صغرا صدف کے اعزاز میں منعقدہ محفل مشاعرہ کے بعد شعراء جاوید رضی، جاوید شیدا، ڈاکٹر ضیا الحسن، ڈاکٹر کوثر محمود، حسن عباسی، اقراء اسلم، رقیہ غزل، حرا رانا، وسیم عباس، زاہد عباس، حمیدہ شاہین، ڈاکٹر صغرا صدف، خالد شریف، عباس تابش اور رخسانہ نور

الحمرا آرٹس کونسل کے زیر اہتمام عالمی ادبی و ثقافتی کانفرنس میں ابرار ندیم اپنا مضمون پڑھتے ہوئے
سٹیج پر ڈاکٹر انعام الحق جاوید، عطاء الحق قاسمی، وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات پرویز رشید، ڈاکٹر یونس بٹ اور ڈاکٹر فریدہ فاروقی تشریف فرما ہیں

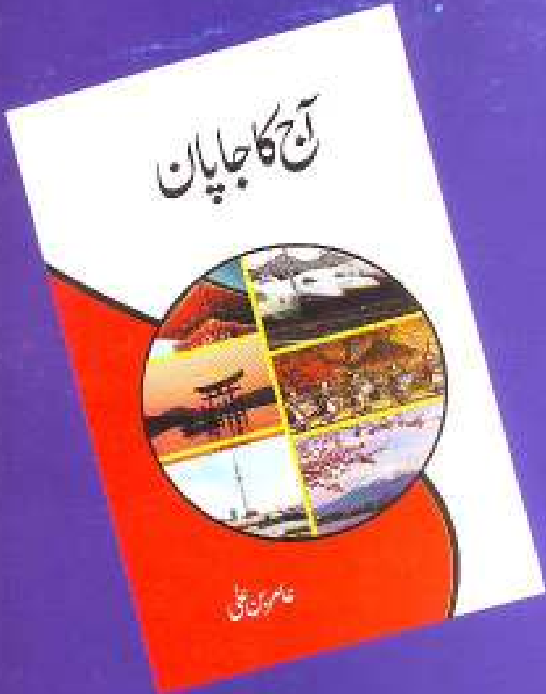

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com

معروف شاعر، کالم نویس اور مترجم عامر بن علی کا سفرنامہ "آج کا جاپان"
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

"آج کا جاپان" کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ!

میں نے دنیا کے جو مختلف ممالک دیکھے ہیں ان میں جاپان کو کئی لحاظ سے بہترین ملک پایا ہے اس لیے عامر بن علی کی اس تصنیف کو میں پاکستانی قوم کے لیے ایک تحفہ تصور کرتا ہوں۔ انھوں نے جاپان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو دیکھا، جانا اور پرکھا ہے اور پھر ان کی سچی، کھری اور بے لاگ تصویریں تیار کی ہیں۔ اس میں سفرنامے کا لطف بھی ہے اور قیام نامے کی گہرائی بھی۔ سفرناموں میں کسی ملک کا سرسری سا ذکر ہوتا ہے اور بہت سی دیگر تفصیلات کے ساتھ انھیں ضخیم کتاب کی شکل دے دی جاتی ہے۔ ان میں اکثر اوقات مشاہدہ سرسری اور غلط بھی ہوتا ہے لیکن کسی ملک میں قیام کرنے سے وہاں کی حقیقی زندگی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب میں سفرنامہ اور قیام نامہ دونوں کی خوبیوں کو یکجا کیا گیا ہے اور رواں، سلیس، ہلکی پھلکی نثر میں بہت کام کی باتیں تحریر کی گئی ہیں۔

اس کتاب کی پاکستانی معاشرے کو بہت ضرورت ہے۔ شاید اس کے مطالعے سے چند افراد کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہمیں بھی اپنے ملک اور قوم کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے جاپان سے کیا کچھ سیکھنا ہے۔

یک حرف کاشکے کہ بصد جا نوشتہ ایم

خواجہ محمد زکریا
پروفیسر امیریٹس (اردو)
پنجاب یونیورسٹی، لاہور